اکادمی ادبیات پاکستان

پاکستانی
ادب کے
معمار

ڈاکٹر وحید قریشی: شخصیت اور فن

ڈاکٹر گوہر نوشاہی

پاکستانی ادب کے معمار

ڈاکٹر وحید قریشی
شخصیت اور فن

پاکستانی ادب کے معمار

ڈاکٹر وحید قریشی

شخصیت اور فن

ڈاکٹر گوہر نوشاہی

اکادمی ادبیات پاکستان

نگرانِ اعلیٰ	:	افتخار عارف
منتظم	:	محمد انور خان
تدوین و طباعت	:	سعیدہ درانی
اسکیچ		احمد حبیب
اشاعت	:	2006
تعداد	:	500
ناشر	:	اکادمی ادبیات پاکستان، H-8/1، اسلام آباد
مطبع	:	پوسٹ آفس فاؤنڈیشن پریس، اسلام آباد
قیمت	:	مجلد :-/115 روپے پیپر بیک:-/110روپے

ISBN: 969-472-185-7

فہرست

پیش نامہ

اکادمی ادبیات پاکستان نے 1990ء میں پاکستانی زبانوں کے ممتاز تخلیق کاروں کے بارے میں ''پاکستانی ادب کے معمار'' کے عنوان سے ایک اشاعتی منصوبے پر کام شروع کیا تھا۔ معماران ادب کے احوال و آثار کو زیادہ سے زیادہ لوگوں تک پہنچانے کے لئے یہ کتابی سلسلہ بہت مفید خدمات انجام دے رہا ہے۔ اکادمی تمام زبانوں کے نامور ادیبوں، شاعروں، افسانہ نگاروں اور نقادوں کے بارے میں تعارفی نوعیت کی کتابیں شائع کرنا چاہتی ہے۔ ہماری کوشش یہ ہے کہ ان کتابوں کی ضخامت، معیار اور مندرجات یکساں ہوں۔

ڈاکٹر وحید قریشی محقق ہیں، مترجم ہیں اسکالر ہیں، شاعر ہیں، استاد ہیں اور ایسی ہمہ جہت شخصیت کہ جن کی ساری زندگی جہانِ فکر و دانش کے در و بام تعمیر کرتے، سنوارتے، سجاتے گزری اور گزر رہی ہے۔

ڈاکٹر وحید قریشی کی زندگی اور ادبی خدمات کے حوالے سے پیش نظر کتاب ملک کے معروف محقق اور نقاد ڈاکٹر گوہر نوشاہی نے بڑی توجہ اور محنت کے ساتھ تحریر کی ہے۔ ڈاکٹر گوہر نوشاہی کی یہ کتاب ڈاکٹر وحید قریشی کی شخصیت اور فن کے بعض اہم گوشوں سے متعارف کرانے اور ان کے کام کو سمجھنے، سمجھانے میں یقیناً معاون ثابت ہوگی۔

مجھے یقین ہے کہ اکادمی ادبیات پاکستان کا اشاعتی منصوبہ ''پاکستانی ادب کے معمار'' ادبی حلقوں کے علاوہ عوامی سطح پر بھی پسند کیا جائے گا۔

افتخار عارف

پیش لفظ

ڈاکٹر وحید قریشی ایک نامور محقق اور ممتاز دانش ور ہیں۔ ان کی علمی و ادبی خدمات کی لاتعداد جہتیں ہیں۔ جنھیں محدود اوراق کی تنگنائے میں سمونا آسان نہیں ہے۔ زیرِ نظر کتاب میں ان کی ہمہ جہت شخصیت اور بلند پایہ علمی خدمات کی محض ایک جھلک پیش کی گئی ہے۔

ڈاکٹر وحید قریشی کے سوانح، شخصیت اور علمی خدمات پر اس سے پہلے میری تین تحریریں منظر عام پر آچکی ہیں، دو اردو میں اور ایک فارسی میں۔

(۱) ارمغان علمی طبع لاہور ۱۹۹۸ء میں شامل میرا مقالہ: ڈاکٹر وحید قریشی: سوانح و شخصیت

(۲) کتابیات وحید، مطبوعہ المعارف، گنج بخش روڈ، لاہور ۱۹۰۹ء

(۳) استاد ارجمند دکتر وحید قریشی مشمولہ ''دانش'' فصلنامہ شمارہ نمبر ۱۶، ۱۹۸۹ء، رایزنی فرہنگی جمہوری اسلامی ایران، اسلام آباد

زیرِ نظر کتاب میں یہ تحریریں بنیادی طور پر شامل ہیں۔ کتابیات وحید میں ڈاکٹر وحید قریشی کی کتابوں اور مقالوں کی اجتماعی فہرست میں جناب رفاقت علی شاہد نے اضافہ کیا اور انہیں مذکورہ صدر کتاب ''ارمغان علمی'' میں شائع کرایا۔ علاوہ ازیں عزیز مکرم طاہر مسعود صاحب نے ڈاکٹر صاحب کے سوانحی خاکے کو از سرِ نو ترتیب دیا جو میری ادارت میں لاہور سے شائع ہونے والے سہ ماہی جریدے نوادر میں چھپ چکا ہے۔ زیرِ نظر کتاب میں ان کاموں سے بھی کماحقہ استفادہ کیا گیا ہے۔

''پاکستانی ادب کے معمار'' اکادمی ادبیات پاکستان کا ایک مفید اور علمی سلسلہ ہے جس سے مستقبل میں تاریخ ادبیات پاکستان لکھنے میں مدد ملے گی۔ ڈاکٹر وحید قریشی کے احوال و آثار پر زیرِ نظر کتاب میں اسی نکتے کو مدنظر رکھا گیا ہے۔

اس کتاب کی اشاعت کے لیے میں جناب افتخار عارف کی خاص توجہ کا شکر گزار ہوں۔

ڈاکٹر گوہر نوشاہی

سوانحی کوائف ایک نظر میں

نام : عبدالوحید

قلمی نام : ڈاکٹر وحید قریشی

پیدائش : ۱۴فروری ۱۹۲۵ء

جائے پیدائش : میانوالی خاص

تعلیمی قابلیت : بی۔اے (آنرز) گورنمنٹ کالج، لاہور، ۱۹۴۴ء

ایم۔اے (فارسی) ۱۹۴۶ء

ایم۔اے (تاریخ) پنجاب یونیورسٹی لاہور، ۱۹۵۲ء

ڈی۔لٹ (اردو) پنجاب یونیورسٹی، لاہور، ۱۹۶۵ء

ملازمتی مصروفیات

۱۔ الفریڈ پٹیالہ ریسرچ سکالر۔ پنجاب یونیورسٹی، لاہور۔ ۱۹۴۷ء تا ۱۹۵۰ء

۲۔ لیکچرر تاریخ، اسلامیہ کالج، گوجرانوالہ۔ ۶ فروری ۱۹۵۱ء تا ۳۱ دسمبر ۱۹۵۶ء

۳۔ لیکچرر تاریخ، اسلامیہ کالج لاہور ۲ جنوری ۱۹۵۷ء تا ۲۴ اگست ۱۹۵۸ء

۴۔ لیکچرر صدر شعبہ فارسی اسلامیہ کالج سول لائنز، لاہور ۲۵۔اگست ۱۹۵۸ء تا ۲۰ دسمبر ۱۹۶۲ء

۵۔ لیکچرار اردو پنجاب یونی ورسٹی، لاہور ۲۱ دسمبر ۱۹۶۲ء تا ۲۰ دسمبر ۱۹۶۶ء

۶۔ ریڈر (ایسوسی ایٹ پروفیسر) ایضاً ۲۱ دسمبر ۱۹۶۶ء تا ۲۴ اپریل ۱۹۷۵ء

۷۔ غالب پروفیسر ایضاً ۲۵ اپریل ۱۹۷۵ء تا ۱۳ فروری ۱۹۸۵ء

۸۔ ڈائریکٹر اور سیکرٹری، ریسرچ سوسائٹی آف پاکستان، لاہور۔ سیکرٹری دیال سنگھ ٹرسٹ لائبریری ایسوسی ایٹ پروفیسر (سابق ریڈر کے مساوی) ۲ دسمبر ۱۹۶۳ء تا ۲ ستمبر ۱۹۶۴ء

۹۔ ناظم اقبال اکادمی پاکستان، لاہور (اضافی فرائض) ۱۹۸۲ء تا ۱۹۸۳ء

۱۰۔ صدر شعبہ اردو، پنجاب یونی ورسٹی (مختلف اوقات) ۹ سال

۱۱۔ انچارج شعبہ پنجابی، پنجاب یونیورسٹی ۱۹۷۰ء تا ۱۹۷۳ء

۱۲۔ ڈین رصدر شعبہ علوم شرقیہ و اسلامیہ ۲۰ اپریل ۱۹۷۵ء تا یکم فروری ۱۹۸۱ء

۱۳۔ صدر نشین، مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد ۱۹۸۲ء تا ۱۹۸۷ء

۱۴۔ اعزازی معتمد، بزم اقبال لاہور ۱۹۸۷ء تا ۱۹۹۳ء

۱۵۔ پروفیسر شعبہ ابلاغیات (حمید نظامی چیئر) جامع پنجاب لاہور ۲۳ فروری ۱۹۹۱ء تا ۳۱ دسمبر ۱۹۹۲ء

۱۶۔ ناظم اقبال اکادمی پاکستان لاہور ۹ ستمبر ۱۹۹۳ء تا ۱۲ جون ۱۹۹۷ء

جامعاتی مصروفیات

الف۔ منصبی مصروفیات (STATUTORY)

۱۔ ممبر سنڈیکیٹ جامعہ پنجاب لاہور (۱۹۷۵ء تا ۱۹۸۰ء)

۲۔ ممبر مالیاتی مجلس (ایضاً)

۳۔ چیئرمین رصدر لائبریری کمیٹی (ایضاً) ۴ سال

۴۔ چیئرمین رصدر ایفلی ایشن کمیٹی (ایضاً) تین سال

۵۔ پرنسپل یونیورسٹی اورینٹل کالج لاہور (۱۹۷۹ء تا ۱۹۸۲ء)

۶۔ صدر شعبہ پنجابی جامع پنجاب لاہور (۱۹۷۶ء، ۱۹۸۰ء تا ۱۹۸۲ء)

۷۔ رکن بورڈ آف اسٹڈیز فارسی جامع پنجاب لاہور

۸۔ ایضاً اردو (۱۹۶۲ء تا ۱۹۸۲ء)

۹۔ ایضاً پنجابی (۱۹۸۷ء تا ۱۹۹۵ء)

۱۰۔ بہاء الدین زکریا یونیورسٹی ملتان (۱۹۸۵ء تا ۱۹۹۳ء)

۱۲۔ رکن بورڈ آف ہائر سٹڈیز ایضاً (۱۹۸۷ء تا حال)

۱۳۔ رکن مجلس انتظامی ساؤتھ ایشین سٹڈیز سنٹر، جامع پنجاب لاہور (۱۹۸۶ء تا حال)

۱۴۔ ڈائریکٹر رصدر، ایضاً (۱۹۸۱ء۔ اضافی عہدہ)

(ب) غیر منصبی (NON-STATUTORY)

۱۔ صدر رچیئرمین مجلس خرید و طلب، جامع پنجاب لاہور (۱۹۷۹ء تا ۱۹۸۲ء)

۲۔ رکن امتحانی مجلس (ایضاً)
۳۔ رکن داخلہ مجلس، (ایضاً) (۱۹۷۵ء تا ۱۹۸۲ء)
۴۔ رکن عمل درآمد مجلس (تین سال)
۵۔ چیئرمین صدر ذیلی مجلس برائے غیر نصابی سرگرمیاں (برائے داخلہ) ۱۹۸۱ء
۶۔ چیئرمین صدر کیلنڈر کمیٹی ۱۹۷۵ء تا ۱۹۸۲ء

دیگر سرکاری و نیم سرکاری مصروفیات

۱۔ رکن پاکستان رائٹرز گلڈ (۱۹۶۱ء تا حال)
۲۔ رکن عاملہ، مغربی پاکستان اردو اکیڈمی لاہور۔ (۱۹۶۲ء) تا حال
۳۔ معتمد اعلیٰ ایضاً (۱۹۸۶ء تا حال)
۴۔ رکن عاملہ اردو تدریس کانفرنس (۱۹۶۲ء تا حال)
۵۔ نامزد رکن عاملہ، مجلس ترقی ادب لاہور (۱۹۶۵ء تا ۱۹۶۸ء، ۱۹۸۰ء تا ۱۹۸۳ء۔ ۱۹۹۱ء تا ۱۹۹۴ء)
۶۔ رکن انتظامیہ وادبی مجلس ایضاً
۷۔ رکن پروگرام کمیٹی برائے سکول براڈ کاسٹ تدریسی نشریات، ریڈیو پاکستان (۱۹۶۵ء تا ۱۸۶۷ء)
۸۔ نامزد رکن، انجمن فارسی بورڈ آف سیکنڈری ایجوکیشن مجلس ثانوی تعلیم، لاہور (۱۹۶۵ء تا ۱۹۶۶ء)
۹۔ معتمد مغربی پاکستان رائٹرز گلڈ (۱۹۶۵ء تا ۱۹۶۷ء)
۱۰۔ رکن ایشیاٹک سوسائٹی آف پاکستان ڈھاکا (۱۹۶۶ء تا ۱۹۷۱ء)
۱۱۔ رکن عاملہ، مجلس برائے بین الاقوامی غالب سیمی نار (۱۹۷۰ء)
۱۲۔ رکن اردو مجلس برائے اصلاح نصاب
۱۳۔ کنونیئر، فارسی کمٹی برائے اصلاح نصاب
۱۴۔ رکن، ادارتی مجلس اردو لغت بورڈ کراچی (۱۹۸۳ء تا ۱۹۸۷ء)
۱۵۔ رکن، لائبریری کمیٹی، میونسپل لائبریری، گوجرانوالہ (۱۹۵۶ء)
۱۶۔ رکن مجلس، پنجاب پبلک لائبریری، لاہور (۱۹۷۹ء تا ۱۹۸۲ء)
۱۷۔ رکن، دیال سنگھ ٹرسٹ لائبریری کمیٹی (۱۹۷۸ء تا ۱۹۸۲ء)
۱۸۔ رکن ایکوزیشن کمیٹی، لاہور عجائب گھر (۱۹۷۹ء تا ۱۹۸۲ء۔ ۱۹۸۸ء۔ ۱۹۹۶ء)

۱۹۔ رکن، قومی مرکز برائے علامہ اقبال صدی تقریبات (۱۹۷۶ء تا ۱۹۷۸ء)

۲۰۔ رکن مقتدرہ قومی زبان، حکومت پاکستان، اسلام آباد (۱۹۷۹ء تا ۱۹۸۲ء)

۲۱۔ صدر، نصابی نظر ثانی مجلس، مرکزی حکومت (۱۹۸۴ء، ۱۹۸۵ء)

۲۲۔ رکن مجلس، انتظامی بین الاقوامی اقبال کانفرنس یونیورسٹی لاہور (۱۹۸۹ء)

۲۳۔ رکن، انتخابی انتظامیہ کمیٹی نقوش ایوارڈ (صدر پاکستان کا نامزد کردہ) (۱۹۸۵ء تا حال)

۲۴۔ رکن، مجلس انتظامی اردو سائنس بورڈ، لاہور (۱۹۸۳ء تا ۱۹۸۷ء)

۲۵۔ صدر، پنجابی دائرہ المعارف، اکادمی ادبیات پاکستان، اسلام آباد (۱۹۸۷ء تا ۱۹۸۸ء)

۲۶۔ منصف، صدارتی مجلس برائے بچگان (۱۹۶۶ء)

۲۷۔ مصنف برائے داؤد ادبی انعام (۱۹۶۷ء، ۱۹۸۲ء، ۱۹۸۴ء)

۲۸۔ منصف برائے آدم جی ادبی انعام (۱۹۶۵ء، ۱۹۸۰ء، ۱۹۸۳ء، ۱۹۸۵ء)

۲۹۔ رکن ایوارڈ کمیٹی ''اقبال ایوارڈ'' (۱۹۸۶ء۔ ۱۹۹۶ء)

۳۰۔ رکن ایوارڈ کمیٹی ''دادا بھائی'' سیرت ایوارڈ (۱۹۸۷ء، ۱۹۸۸ء)

۳۱۔ رکن ایوارڈ کمیٹی وزارت مذہبی امور ''سیرت ایوارڈ'' (۱۹۸۶ء)

۳۲۔ رکن، مجلس انتظامی انجمن ترقی اردو پاکستان، کراچی (۱۹۸۷ء تا حال)

۳۳۔ رکن خرید کتب کمیٹی لائبریری فاؤنڈیشن پنجاب لاہور (۱۹۹۸ء تا ۱۹۹۶ء)

رکنیت

۱۔ رکن حلقہ ارباب ذوق (۱۹۴۵ء تا حال)

۲۔ نائب معتمد، جامعہ پنجاب انجمن عربی و فارسی (۱۹۴۷ء تا ۱۹۵۰ء)

۳۔ معتمد، یونیورسٹی اردو کانفرنس (۱۹۴۸ء)

۴۔ معتمد عمومی اورینٹل کالج اولڈ بوائے ایسوسی ایشن و تنظیم طلبہ قدیم اورینٹل کالج، لاہور (۱۹۵۰ء تا ۱۹۹۲ء)

۵۔ صدر، بزم ادب، گوجرانوالہ (۱۹۵۶ء تا ۱۹۶۱ء)

۶۔ رکن عاملہ، اورینٹل کانفرنس (۱۹۵۲ء)

۷۔ صدر بزم ادب، گوجرانوالہ (۱۹۵۶ء تا ۱۹۶۱ء)

۸۔ معتمد، پنجابی ادبی کمیٹی، لاہور (۱۹۵۸ء)

۹۔ معتمد، حلقہ ارباب ذوق (۱۹۵۸ء)
۱۰۔ رکن پاکستان ہسٹاریکل سوسائٹی، کراچی (۱۹۵۸ء تا حال)
۱۱۔ رکن عاملہ، پاکستان ہسٹاریکل سوسائٹی، کراچی (۱۹۷۲ء تا حال)
۱۲۔ معتمد عمومی، ادبی مجلس (۱۹۵۹ء تا حال)
۱۳۔ رکن مجلس عاملہ، مرکزیہ مجلس اقبال، لاہور (۱۹۶۰ء تا حال)
۱۴۔ رکن پنجابی ادبی بورڈ (۱۹۶۳ء تا حال)
۱۵۔ صدر، اردو مجلس (۱۹۶۳ء تا ۱۹۶۹ء)
۱۶۔ رکن، مجلس یادگار غالب (۱۹۶۷ء تا ۱۹۶۹ء)
۱۷۔ فیلو، اکادمی ادبیات (۱۹۹۴ء)

کانفرنس میں شرکت

۱۔ یونیورسٹی اردو کانفرنس (سیکرٹری ۱۹۴۸ء)
۲۔ اورینٹل کانفرنس، لاہور (رکن عاملہ ۱۹۵۶ء)
۳۔ اردو تدریس کانفرنس (رکن عاملہ ۱۹۶۲ء)
۴۔ پاکستان ہسٹری کانفرنس پشاور (وفید اور مقالہ ۱۹۵۴ء)
۵۔ بین الاقوامی غالب سیمی نار، جامعہ پنجاب، لاہور (مجلس عاملہ ۱۹۷۰ء)
۶۔ سیمی نار برائے تدریسی فارسی، وزارت ایران مقالہ (۱۹۷۰ء)
۷۔ صد سالہ اقبال سیمی نار نئی دہلی بھارت (۱۹۷۶ء)
۸۔ پاکستان ہسٹری کانفرنس (صدارت اور مقالہ ۱۹۷۸ء تا ۱۹۷۹ء)
۹۔ اسلامی دنیا کی تعلیم پر سیمی نار، اسلام آباد (۱۹۷۹ء)
۱۰۔ پہلی کل پاکستان مصنفین کانفرنس، اکادمی ادبیات پاکستان، اسلام آباد (۱۱ تا ۱۳ اپریل ۱۹۷۹ء)
۱۱۔ دوسری کل پاکستان مصنفین کانفرنس، اکادمی ادبیات پاکستان، اسلام آباد ۲۵، ۲۶ نومبر ۱۹۸۰ء
۱۲۔ تیسری کل پاکستان مصنفین کانفرنس، اکادمی ادبیات پاکستان، اسلام آباد (۲۸، ۲۹ دسمبر ۱۹۸۱ء)
۱۳۔ جامعہ پنجاب کانفرنس (داعی رکنونیئر، مجلس نمائش کتب ۱۹۸۲ء
۱۴۔ چوتھی کل پاکستان مصنفین کانفرنس، اکادمی ادبیات پاکستان، اسلام آباد (وفد ۶ تا ۸ اکتوبر ۱۹۸۳ء)
۱۵۔ علاقائی ادبیات کانفرنس، اکادمی ادبیات پاکستان (صدر ۶ ستمبر ۱۹۸۴ء)

۱۶۔ پانچویں کل پاکستان مصنفین کانفرنس، اکادمی ادبیات پاکستان (۲۶ تا ۲۷ جون ۱۹۸۷ء)
۱۷۔ چھٹی کل پاکستان مصنفین کانفرنس (صدر ۱۷ تا ۱۸ اکتوبر ۱۹۸۷ء)
۱۸۔ ساتویں کل پاکستان مصنفین کانفرنس (۱۹۹۴ء)
۱۹۔ بین الاقوامی اردو کانفرنس، لندن (۲۰۰۰ء)

ادارت

۱۔ ''صحیفہ''، مجلس ترقی ادب، لاہور (۱۹۶۶ء تا ۱۹۷۳ء)
۲۔ ''جنرل آف ریسرچ سوسائٹی'' جامعہ پنجاب، لاہور (۱۹۶۳ء)
۳۔ ''اورینٹل کالج میگزین یونیورسٹی اورینٹل کالج، لاہور (۱۹۸۰ء تا ۱۹۸۲ء)
۴۔ مجلس تحقیق جامع پنجاب، لاہور (۱۹۷۷ء تا ۱۹۸۲ء)
۵۔ ''اقبال ریویو'' (اردو، انگریزی، فارسی) اقبال اکادمی پاکستان، لاہور (۱۹۸۲ء تا ۱۹۹۵ء تا ۱۲ جون ۱۹۹۷ء)
۶۔ اخبار اردو، مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد (۱۹۸۴ء تا ۱۹۸۸ء)
۷۔ ''اقبال'' بزم اقبال، لاہور (۱۹۸۸ء تا ۱۹۹۵ء)

اعزازات

۱۔ طفیل ایوارڈ (۱۹۸۶ء)
۲۔ صدارتی تمغا برائے حسن کارکردگی حکومت پاکستان (۱۹۹۳ء)

خاندان

عبدالوحید نام، وحید تخلص اور ڈاکٹر وحید قریشی قلمی پہچان ہے۔ آبائی شجرہ چھ واسطوں سے سلسلہ قادریہ کے ممتاز صوفی اور صاحب ولایت بزرگ حضرت شاہ جمال نوری (م ۱۰۶۱ء) سے ملتا ہے۔ جو ستائیس واسطوں سے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی اولاد سے تھے۔ یہ شجرہ اس ترتیب سے ہے:
حضرت شاہ جمال نوری بن شاہ یداللہ ین بن حسام الدین بن محمد شریف بن محمد حاجی بن محمد احمد بن عبدالرحمٰن بن محمد، شریف بن شیخ معروف بن داؤد بن وجہ الدین بن نجم الدین بن سلیمان بن شیخ ابراہیم بن عبدالشکور بن علاؤالدین بن مودود بن شیخ محمد قاسم بن عبداللہ درمی بن عبدالمجید بسطامی بن ابوالحسن از رونی بن محمد راضی بن محمود بغدادی بن جعفر بغدادی بن ابویوسف بن محمد قاسم بغدادی بن شیخ ابومحمد مکی بن ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ۔

حضرت شاہ جمال نوری ؒ صرف ایک واسطے سے حضرت میاں میر لاہوریؒ کے مرید تھے۔ یعنی حضرت شاہ جمال، حضرت ابوسعید سے اور حضرت ابوسعیدؒ حضرت میاں میرؒ لاہوری سے بیعت تھے۔ ڈاکٹر احمد حسین قلعداری کے بہ قول ان کے جد اعلیٰ محمد بن قاسم کی قیادت میں برعظیم میں آئے تھے۔ اسلامی فتوحات کے بعد آپ کچھ عرصہ اُچ میں مقیم ہوئے اور بعد ازاں ایک شاخ نے ڈیرہ غازی خان بہ مقام حضرت والا میں سکونت اختیار کی اور درس وتدریس میں مشغول ہوئے۔ حضرت شاہ جمال نے علوم ظاہری و باطنی کی ابتدائی تعلیم و تربیت اپنے گھر پر حاصل کی۔ بعد ازاں تلاش علم وعرفان میں لاہور کا سفر اختیار کیا۔ یہاں پر حضرت اسماعیل عرف میاں وڈا کے درس میں شامل ہو گئے اور علوم دینی کے اعلیٰ مدارج طے کیے۔ فیضانِ باطن کی جستجو میں حضرت میاں میرؒ کے حلقہ ارادت میں آئے۔ انہوں نے ان کی تربیت اپنے مرید خاص اور خلیفہ حضرت شاہ ابوسعیدؒ کے سپرد کی۔ روحانی تربیت کے بعد اپنے مرشد کے ارشاد پر موضوع کھیالی متصل گوجرانوالہ میں چلے آئے اور تبلیغ اسلام اور رشد و ہدایت کی مسند پر متمکن ہوئے۔ آپ کی تبلیغ سے ہزاروں غیر مسلم حلقۂ اسلام میں آئے اور لاکھوں گم کردہ راہوں نے ہدایت پائی۔ آستانہ مبارک گوجرانوالہ میں بیرون کھیالی دروازہ، مرجع خلائق ہے۔

حضرت شاہ جمال نوری کے دو فرزند تھے۔ حضرت شاہ عبدالرحیم اور حضرت شاہ عبدالکریم۔ حضرت شاہ عبدالرحیم بڑے بیٹے ہونے کے سبب سجادہ نشین اور صاحب ارشاد قرار پائے۔ ڈاکٹر احمد حسین قلعداری کے مرتب کردہ شجرے کے مطابق حضرت شاہ عبدالرحیم کے بعد ان کے صاحبزادے حضرت شیر محمد غازی سجادہ نشین ہوئے جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ حضرت شیر محمد غازی دوسرے بھائیوں سے عمر میں بڑے تھے۔ حضرت شاہ عبدالرحیم کے دیگر فرزندوں میں شاہ الہ دین، شاہ محمد علی اور شاہ خدابخش کے نام ملتے ہیں۔

شاہ عبدالرحیم کے بیٹے مولوی خدابخش کے ایک فرزند مولوی محمد سعید تھے جن کے چار بیٹے تھے: مولوی صدرالدین، مولوی نظام الدین، مولوی کرم الدین اور مولوی محکم دین۔

ڈاکٹر وحید قریشی کے پردادا مولوی محمد اشرف قریشی صدیقی، مولوی نظام الدین کے بیٹے تھے۔ مولوی محمد اشرف قریشی اس خاندان کے پہلے فرد تھے۔ جنہوں نے انگریزوں کی ملازمت اختیار کی۔ وہ پہلے تحصیل دار اور ریٹائر ہونے کے بعد آنریری مجسٹریٹ کے عہدے پر فائز ہوئے۔ انہوں نے لاہور اور چونیاں دو جگہوں پر اپنی ملازمت کے ماہ و سال پورے کیے اور غالباً (۹۶۔۱۸۹۵ء) میں ریٹائر ہو کر گوجرانوالہ میں سکونت اختیار کی۔ مولوی محمد اشرف قریشی صاحب علم و فضل ہونے کے ساتھ ساتھ اعلیٰ پائے کے خوش نویس بھی تھے۔ ڈاکٹر احمد حسین قلعداری نے ان کے ہاتھ کے لکھے ہوئے قرآن پاک کا ایک نفیس نسخہ دیکھا تھا۔ چنانچہ اس کی تفصیل بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''مولوی محمد اشرف کے قلم کا لکھا ہوا نہایت خوب صورت قرآن مجید کا مذہب نسخہ ہم نے حضرت مولانا غلام جیلانی صاحب (بن مولانا غلام قادر زیرک کھیالی گوجرانوالہ) کے پاس دیکھا تھا۔ اس نسخے کے متعلق ایک اہم روایت گوجرانوالہ میں مشہور تھی کہ گوجرانوالہ کے معروف عالم دین اور با اثر خطاط مولوی سراج دین نے قرآن مجید کا نہایت خوش خط مطلا و نسخہ تحریر کیا اور والئی ریاست بہاول پور نواب صاحب حسین خان کی نذر کیا۔ نواب صاحب نے یہ نسخہ اپنی ریاست کے عجائب خانہ میں دے دیا۔ ۱۹۱۰ء میں امریکن سیاح عجائب خانہ دیکھنے آئے تو اس نسخے کا نذرانہ دس ہزار روپے پیش کرنا چاہا لیکن نواب صاحب نے یہ نسخہ دینے سے انکار کر دیا۔ مولوی محمد اشرف نے یہ نسخہ اسی نسخے کے جواب میں تحریر کیا، جو مولوی سراج دین صاحب کے نسخے سے کسی نوع کم نہیں تھا افسوس قرآن مجید کا یہ خوب صورت نسخہ مولوی غلام جیلانی کی دوسری کتابوں کی طرح محفوظ نہ رہ سکا۔''

مولوی محمد اشرف قریشی کثیر الاولاد تھے۔ انہیں خدا نے سات بیٹے اور دو بیٹیاں عطا کی تھیں۔ سات بیٹوں کے نام یہ ہیں۔ مولوی الٰہی بخش، مولوی حسن دین، مولوی غلام علی، مولوی امام علی، مولوی حامد علی، مولوی احمد اور مولوی امیر علی۔ دو بیویاں تھیں۔ دوسری بیوی سے دو بیٹیاں اور تین بیٹے تھے ان میں سے سب سے بڑے مولوی احمد علی، ڈاکٹر وحید قریشی کے نانا اور سب سے چھوٹے مولوی امیر علی قریشی، ڈاکٹر صاحب کے دادا تھے۔ مولوی احمد علی قریشی میانوالی میونسپل کمیٹی میں آفس سپرینٹنڈنٹ تھے۔ مولوی امیر علی قریشی بھی پڑھے لکھے آدمی تھے۔ پولیس کی نوکری اختیار کی چند سال موضع پٹی (ضلع لاہور) میں ایس ایچ او رہے۔ اس کے بعد چار سال تک ترن تارن پولیس میں سرکل انسپکٹر کے فرائض انجام دیے۔ آخر میں آئی ڈی پولیس میں ڈی ایس پی مقرر کیے گئے۔ وہ پنجاب کے پہلے مسلمان ڈی ایس پی تھے۔ ملازمت کے دوران ہی ان کا انتقال ہوگیا۔ مولوی امیر علی قریشی، کے تین بیٹے اور ایک بیٹی تھی۔ بیٹوں میں سے منجھلے محمد لطیف قریشی، ڈاکٹر وحید قریشی کے والد گرامی تھے۔

محمد لطیف قریشی ۱۲۔ دسمبر ۱۸۹۸ء کو گوجرانوالہ میں پیدا ہوئے۔ خالصہ کالج گوجرانوالہ سے ایف اے کیا۔ اسلامیہ کالج ریلوے روڈ لاہور میں بی۔اے کے آخری سال میں تھے کہ والد کا انتقال ہوگیا۔ اس لیے محکمہ پولیس میں بہ حیثیت سب انسپکٹر ملازم ہو گئے۔ بارہ تیرہ سال ضلع ساہی وال میں گزارے پھر ایس ایچ او مقرر ہو کر لاہور آ گئے، جہاں مزنگ اور انارکلی کے تھانوں میں خدمات انجام دیں۔ لاہور کے بعد کچھ عرصہ ستراہ، پسرور، سمبڑیال اور سیالکوٹ میں بھی ملازمت کے سلسلے میں قیام کیا۔ ۱۹۴۹ء ہرنیا کی شکایت ہوئی۔ جس کے بعد ذاتی مجبوری کی وجہ سے پنشن حاصل کی۔ انہوں نے یکم اگست ۱۹۹۱ء کو رحلت فرمائی۔ شگفتہ مزاجی حلم، تقوی، شرافت اور وضع داری ہر ملنے والے کو ان کا گرویدہ بنا دیتی تھی۔ سراپا شفقت اور سراپا اخلاص تھے۔

محمد لطیف قریشی صاحب کی شادی پچیس سال کی عمر میں اپنے تایا مولوی احمد علی قریشی کی صاحب زادی سے ہوئی۔ مولوی احمد علی قریشی ان دنوں میانوالی میونسپل کمیٹی میں سپرنٹنڈنٹ تھے۔ شادی کے بعد ایک لڑکی پیدا ہوئی، جس کا نام سعیدہ رکھا۔ پھر ڈاکٹر وحید قریشی پیدا ہوئے۔ دونوں کی عمر میں ڈیڑھ سال کا فرق تھا۔ سعیدہ جوان سال تقریباً سولہ سترہ سال کی عمر میں فوت ہوگئیں۔ اس وقت ڈاکٹر وحید قریشی میٹرک میں پڑھتے تھے۔

سوانح و شخصیت

ڈاکٹر وحید قریشی ۱۴ فروری ۱۹۲۵ء کو ہفتے کے دن اپنے نانا کے گھر میانوالی میں پیدا ہوئے۔ کسووال کے پرائمری سکول میں ۱۹۳۰ء میں پڑھائی کا آغاز ہوا۔ کسووال، چیچہ وطنی اور میاں چنوں کے درمیان ضلع ملتان اور ساہی وال کی سرحد پر واقع ہے۔ استاد اور اتالیق کے طور پر ماسٹر خورشید کی خدمات حاصل کی گئیں۔ ماسٹر صاحب نے میٹرک اور منشی فاضل کے امتحان پاس کر رکھے تھے۔ ماسٹر خورشید کی شرافت اور تعلیم و تربیت میں دل چسپی نے ڈاکٹر صاحب کے والد کو اس قدر متاثر کیا کہ وہ جہاں جہاں بھی ملازمت کے سلسلے میں تبدیل ہو کر گئے، ماسٹر خورشید کو ضرور اپنے ساتھ رکھا۔ وہ گورداس پور کے رہنے والے تھے لیکن تقسیم کے بعد ملتان میں مستقل سکونت اختیار کر لی اور آج کل وہیں رہائش پذیر ہیں۔

ڈاکٹر وحید قریشی اپنے والدین کے اکلوتے فرزند ہیں۔ والد اور والدہ نے پرورش اور تربیت میں غیر معمولی دلچسپی لی اور اپنے سایہ عاطفت سے نوازا۔ ڈاکٹر صاحب نے اپنے ایک مقالے ''میں اور حالی'' میں اور راقم السطور سے گفتگو میں اپنے بچپن پر سیر حاصل روشنی ڈالی ہے۔ وہ بتاتے ہیں کہ تیسری جماعت تک وہ کسووال میں تھے اور وہاں سے اپنے ہم جماعتوں کے ساتھ چک نمبر ۴ کے سکول میں آتے تھے۔ چوتھی جماعت میں ان کے والد صاحب کا تبادلہ حویلی (ضلع ساہی وال) ہو گیا اور ساتویں، آٹھویں تک وہیں تعلیم پائی۔ پھر اسلامیہ ہائی سکول بھاٹی گیٹ لاہور سے ۱۹۴۰ء میں میٹرک پاس کیا۔ اس زمانے میں ان کے والد صاحب کی ملازمت لاہور میں تھی میٹرک کے بعد گورنمنٹ کالج لاہور میں داخل ہوئے۔ ڈاکٹر صاحب بتاتے ہیں کہ اس سال اسلامیہ ہائی سکول بھاٹی گیٹ سے صرف تین طالب علموں کو گورنمنٹ کالج لاہور میں داخلہ مل سکا تھا۔ ڈاکٹر صاحب کے علاوہ دوسرے دو طالب علم عنایت اللہ اور جسٹس (ریٹائرڈ) ڈاکٹر جاوید اقبال تھے۔

ڈاکٹر صاحب نے بچپن ہی سے گھر میں ادبی ماحول دیکھا تھا۔ اقبال کی ''بانگ درا'' اور ادبی جریدے ''عالمگیر'' اور ''نیرنگ خیال'' وغیرہ والد صاحب کے مطالعے میں رہتے تھے۔ انہی کی ورق گردانی سے ادبی مطالعے کی ابتداء ہوئی۔ ڈاکٹر صاحب کے اتالیق بھائی خورشید بھی اچھا شعری ذوق

رکھتے تھے۔ شاعری سے لگاؤ اور شاعری کا فنی شعور ان کے اثر سے بیدار ہوا۔ کالج کے زمانے ہی سے اپنی لائبریری بنانے کا شوق پیدا ہوا۔ ایک جگہ لکھا ہے۔ ''۱۹۴۲ء میں جب گورنمنٹ کالج لاہور میں میرا دوسرا سال تھا، جدید اردو شاعری اور فارسی شاعری کی کتابیں جمع کرنے لگا۔'' اسی زمانے میں انہوں نے شاعری شروع کی اور اختر شیرانی، حفیظ جالندھری اور احسان دانش کے تتبع میں شعر کہے۔ کالج میں اپنے فارسی کے استاد اور صاحب اسلوب شاعر صوفی غلام مصطفیٰ تبسم کی ادبی تربیت سے بھی شعر گوئی کے شوق کو جلا ملی۔

کالج کی ابتدائی زندگی میں ڈاکٹر صاحب بے حد کم آمیز اور قدرے محجوب تھے۔ اس کم آمیزی کا ایک فائدہ یہ ہوا کہ بے معنی محفل آرائی اور دوست گردی سے بچ کر وہ تعلیمی تگ و دو اور مطالعے میں منہمک ہو گئے لیکن ایف اے کے بعد تنہائی کا یہ خول ٹوٹ گیا۔ بی اے کے دونوں سال آزاد مطالعے، تلاش ذات اور کشف ذات میں بسر ہوئے۔ گھر کا ماحول سازگار، مہربان اور سایہ رحمت والا تھا۔ سراپا شفقت والدین، زندگی کے تمام وسائل قربان کرنے والے، ہمہ جہت مطالعے کا شوق اور زندگی میں بلند ترین مقام حاصل کرنے کا نصب العین، ان سب چیزوں نے مل کر ایک ایسی شخصیت کی نشوونما شروع کی جس کے فکری مدار میں علم و ادب کے میدان میں فتوحات کا سلسلہ قائم ہوا۔ تاریخ، منطق، اردو نثر، اردو شاعری، فارسی شاعری، فارسی افسانہ اور نفسیات کا ہمہ جہت اور آوارہ خرام مطالعہ ڈاکٹر صاحب کے بی اے کے دونوں برسوں میں جاری رہا۔ شاعری بھی دامن سے بندھی رہی۔ کالج میگزین ''راوی'' کے علاوہ ''شاہکار'' لاہور میں بھی کلام شائع ہوتا تھا۔ ''میں اور حالی'' والے مضمون میں لکھا ہے کہ ایک جنون تھا جو دن رات طاری تھا۔

۱۹۴۴ء میں ڈاکٹر وحید قریشی نے گورنمنٹ کالج سے بی اے کرنے کے بعد کالج کی طرف ہی سے ایم۔ اے فارسی میں داخلہ لیا اور پنجاب یونیورسٹی اورینٹل کالج میں آنے لگے۔ ۱۹۴۶ء میں ایم اے فارسی کیا۔ ایک سال (۱۹۴۷ء) ایم اے تاریخ کی کلاسوں کی تکمیل کی اور ۱۹۵۰ء میں پنجاب یونیورسٹی سے ایم اے تاریخ کی ڈگری حاصل کی۔ ۱۹۴۷ء میں فارسی میں پی ایچ ڈی کرنے کے لیے ڈاکٹر صاحب کو الفرڈ پٹیالہ ریسرچ سکالرشپ ملا۔ آپ نے ۱۹۵۰ء میں فارسی کی ڈاکٹریٹ مکمل کی اور ۱۹۵۲ء میں انہیں ڈگری مل گئی۔ زمانہ طالب علم میں ہی ڈاکٹر صاحب کے والد گرامی نے ریٹائرمنٹ حاصل کی جس کے بعد گھر میں قدرے اقتصادی مشکلات بھی پیدا ہوئیں۔ ڈاکٹر صاحب نے مجھے ایک انٹرویو میں اپنے یونیورسٹی میں طالب علمی کے دور کے بارے میں بتایا کہ:

> ''جب میں تاریخ میں ایم اے کر رہا تھا، مجھے الفرڈ پٹیالہ ریسرچ سکالرشپ مل گیا تاکہ میں فارسی میں پی ایچ ڈی کر لوں۔ اس زمانے میں والد صاحب پنشن

پر آ گئے تھے لیکن ان کی مالی حالت اتنی مستحکم نہیں تھی تاہم انہوں نے گوجرانوالہ شہر کے قریب ایک زمانے میں دو ایکٹر زمین خرید لی تھی۔ وہ بعد میں انہوں نے پلاٹ بنا کر فروخت کی اور میری تعلیم زیادہ تر ان پلاٹوں کی مدد ہی سے ہوتی رہی۔ الفریڈ پٹیالہ ریسرچ سکالرشپ میں مجھے ۶۷ روپے ماہانہ وظیفہ ملتا تھا اور میں یونیورسٹی کا ملازم تصور کیا جاتا تھا۔ سو روپے کے قریب والد صاحب گھر سے بھیج دیتے تھے اس طرح میں آدھے پیسے خرچ کر لیتا اور آدھے پیسوں کی کتابیں خرید لیتا۔"

ڈاکٹر صاحب گورنمنٹ کالج میں تعلیم کے دوران ایک سال نیو ہوسٹل میں رہتے رہے پھر ایک سال گواڈرینگل میں بھی رہے لیکن یونیورسٹی میں ریسرچ سکالرشپ کے دوران اورینٹل کالج ہوسٹل میں آ گئے تھے۔ اس دوران آپ ایم اے فارسی کو بھی پڑھاتے تھے۔ پی ایچ ڈی کا مقالہ یونیورسٹی کے حوالے کرنے کے بعد انہوں نے سی ایس ایس کا امتحان والدین کے مجبور کرنے پر دیا جس میں ان کی پینتالیسویں یا چھیالیسویں پوزیشن تھی اور انٹرویو میں آٹھویں نمبر پر تھے۔ پوسٹل سروس کے لیے منتخب بھی ہو گئے تھے لیکن اپنی افتادِ طبع کے منافی جان کر ادھر کا رخ نہیں کیا۔ اس دوران اسلامیہ کالج گوجرانوالہ میں لیکچرار کی اسامی پر ۱۹۵۱ء میں تعینات ہو گئے جہاں چھ سال تک ملازمت کی۔ پنجاب یونیورسٹی میں تعلیم کے دوران ڈاکٹر جن اساتذہ سے خصوصی طور پر مستفید ہوئے ان میں سے سید عابد علی عابد، ڈاکٹر پروفیسر محمد اقبال، ڈاکٹر سید عبداللہ اور پروفیسر عباس شوستری کے نام قابلِ ذکر ہیں۔ ان کے علاوہ پروفیسر مولوی محمد شفیع جیسے اکابر، صاحبانِ علم اور اساتذہ نام دار نے فنِ تحقیق کے بنیادی اسرار و رموز سمجھائے۔

اسلامیہ کالج گوجرانوالہ سے ڈاکٹر وحید قریشی، اسلامیہ کالج ریلوے روڈ لاہور میں لیکچرار شعبہ تاریخ کی حیثیت سے آ گئے اور اس کے بعد اسلامیہ کالج سول لائنز جب صرف ڈگری کالج بن گیا تو اس میں منتقل ہوئے اور فارسی کے صدر شعبہ مقرر ہوئے۔ متحدہ اسلامیہ کالج کے بارے میں ڈاکٹر صاحب نے ایک ملاقات پر مجھے بعض بہت دل چسپ واقعات سنائے۔ ان واقعات کو ڈاکٹر صاحب کی زندگی کا اہم تجربہ سمجھتے ہوئے میں مختصر طور پر دہرانا چاہتا ہوں۔ ڈاکٹر صاحب نے بتایا:

"زندگی میں مجھے بہت جدوجہد کرنی پڑی ہے اور جو میرا حق تھا وہ بھی بعض اوقات لڑ کر اور چھین کر لینا پڑا ہے۔ مجھے کبھی اپنا حق از خود نہیں ملا۔ جب میں اسلامیہ کالج ریلوے روڈ میں آیا تو میرے ساتھ ایک عجیب واقعہ پیش آیا۔ اس زمانے میں کرنل اسلم پرنسپل تھے۔ میں نے گوجرانوالہ سے درخواست دی لیکن

کرنل اسلم اپنے کسی پسندیدہ شخص کو لینا چاہتے تھے۔ ادھر انجمن نے تعلیم اور تجربے کی بنا پر میرا انتخاب کیا اور مجھے ٹیلی گرام دیا گیا کہ اپنے آنے کی توثیق کریں۔ چنانچہ میں نے ٹیلی گرام ہی سے اپنے آنے کی اطلاع اور رضامندی ارسال کردی۔ وہ ٹیلی گرام پرنسپل کے دفتر سے غائب کردیا گیا۔ چنانچہ مجھے آنے کے بعد بتایا گیا کہ کسی دوسرے شخص کا تقرر ہوگیا ہے کیونکہ آپ نے آنے کی اطلاع نہیں دی۔ ادھر میں گوجرانوالہ کی ملازمت سے مستعفی ہو کر اور کشتیاں جلا کر آیا تھا چنانچہ بڑی تگ ودو کے بعد اپنے حق میں ثبوت فراہم کیے اور اسلامیہ کالج میں تقرر ہوگیا۔ البتہ کرنل اسلم کی مخاصمت ان کے آخری سانس تک جاری رہی تا آنکہ ۱۹۵۸ء میں دونوں اسلامیہ کالج الگ الگ کر دیئے گئے اور پروفیسر حمید احمد خاں مرحوم نے استادگرامی پروفیسر علم الدین سالک سے سوءِ تفاہم کے بعد ان کے بجائے مجھے اسلامیہ کالج سول لائنز میں بہ طور صدر شعبہ فارسی قبول کیا۔ سالک صاحب ریلوے روڈ کالج کے وائس پرنسپل ہوگئے۔"

اسلامیہ کالج سول لائنز میں تدریس کے دوران ڈاکٹر صاحب نے ڈی لٹ اردو کیا۔ اس زمانے میں ڈاکٹر صاحب اورینٹل کالج میں بھی جز وقتی تدریس کے لیے آیا کرتے تھے۔ دسمبر ۱۹۶۲ء میں یونیورسٹی اورینٹل کالج کے شعبہ اردو سے وابستہ ہو کر اسلامیہ کالج سے فارغ ہوئے اور پنجاب یونیورسٹی میں آگئے۔ ۱۹۷۵ء میں شعبہ اردو میں بہ طور غالب پروفیسر تقرر رہا۔ ۱۹۸۰ء میں اورینٹل کالج لاہور میں بہ حیثیت پرنسپل تقرر ہوا اور ۱۹۷۵ء سے ۱۹۸۰ء تک علوم اسلامیہ و علوم شرقیہ کی فیکلٹی کے ڈین رہے۔ ۱۹۸۲ء میں ڈاکٹر صاحب اعزازی ڈائریکٹر اقبال اکیڈمی اور ۱۹۸۳ء میں مقتدرہ قومی زبان کے کل وقتی صدر نشین کے عہدے پر فائز ہوئے اور ۱۹۸۷ء تک اس عہدے پر کام کرنے کے بعد ریٹائر ہوئے۔ چند سال بزم اقبال لاہور کا سربراہ رہنے کے بعد دوبارہ اقبال اکیڈمی کے کل وقتی ڈائریکٹر مقرر ہوئے۔ ڈاکٹر صاحب اقبال اکیڈمی میں اپنے تقرر کی معیاد پوری کرنے کے بعد جون ۱۹۹۷ء میں ملازمت سے فارغ ہو چکے ہیں۔

ڈاکٹر وحید قریشی کی نجی اور علمی زندگی کے بہت سے اہم اور دل چسپ پہلو ہمارے سامنے ہیں۔ نجی زندگی میں بحیثیت فرزند، بہ حیثیت استاد، بہ حیثیت عالم، بحیثیت محقق، بہ حیثیت تخلیق کار ان کی شخصیت کا جائزہ لینے کے لیے ایسے موضوعات ہیں جن کی تفصیل سے ڈاکٹر صاحب کی ایک بھرپور تصویر مرتب کی جا سکتی ہے۔ جہاں تک نجی زندگی کا تعلق ہے ڈاکٹر صاحب کے بارے میں بہت کم کوائف ہمارے علم میں آسکے ہیں، اس لیے کہ ان کے اس پہلو پر کسی نے آج تک کچھ زیادہ نہیں لکھا۔ میں نے اس سلسلے

میں ڈاکٹر صاحب کے اہل خانہ اور خود ڈاکٹر صاحب سے تفصیلی گفتگو کی اور اس کی روشنی میں بعض حقائق اخذ کرنے کی کوشش کی ہے۔ ڈاکٹر صاحب کے والد انہیں دل و جان سے چاہتے تھے۔ اس لیے بھی کہ ڈاکٹر صاحب ان کی اکلوتی اولاد تھے اور اس لیے بھی کہ انہیں ان کی بھرپور شخصیت پر فخر تھا۔ وہ ڈاکٹر صاحب کے علم و فضل اور نیک نامی سے متاثر تھے اور اسے اپنے لیے باعث افتخار سمجھتے تھے۔ میں نے ان کی زندگی میں ایک بار ان سے ڈاکٹر صاحب کے بارے میں طویل گفتگو کی تھی۔ مجھے ابھی تک ان کے یہ مہربان اور سراپا شفقت الفاظ یاد ہیں:

''وحید بچپن ہی سے نہایت فرماں بردار باادب اور محنتی بچہ تھا۔ مجھے اور اس کی والدہ کو اس سے کبھی کوئی شکایت نہیں ہوئی مجھے اس کی زندگی کا کوئی ایسا واقعہ یاد نہیں جس سے مجھے بہ حیثیت باپ خفت یا شرمندگی ملی ہو۔''

اپنے والدین کا ذکر کرتے ہوئے ڈاکٹر صاحب نے مجھ سے ایک مرتبہ فرمایا کہ:

''ان کی ساری توجہ مجھ پر تھی، اس لیے بڑے ناز سے میری پرورش ہوئی۔ میرے ساتھ میرے والد صاحب کا تعلق غیر معمولی تھا۔ میری ملازمت کے دوران اور اس کے بعد بھی ان کے مشورے، ان کا تعاون اور ان کی امداد ہمیشہ میرے شامل حال رہتی تھی۔ والد صاحب سے زیادہ والدہ سے میری رفاقت رہتی تھی اور والدہ بھی مجھ پر بے حد مہربان تھیں۔ بچپن میں مجھے مطالعے کا بہت شوق تھا، جب میں زیادہ پڑھتا تو منع کرتی تھیں کہ تمہاری صحت خراب ہو جائے گی۔ انہوں نے مجھے اتنا پیار دیا کہ میں تمام عمر نہیں بھلا سکوں گا۔''

ڈاکٹر صاحب کے والد گرامی محمد لطیف قریشی صاحب نے یکم اگست ۱۹۹۱ء کو رحلت فرمائی۔ راقم الحروف نے درج ذیل قطعہ تاریخ موزوں کیا:

فغان و شیونی در گنبدِ کمال انداخت
صدای رحلت صافی سرشت و مرد متین
زسال فوت چو پرسیدم از سروش بگفت
نگین فضل محمد لطیف نیک آئین

۱۴۱۲ھ

ڈاکٹر صاحب کی والدہ بھی اس سے کچھ عرصہ بعد انہیں داغ مفارقت دے گئی تھیں۔

ڈاکٹر صاحب کی شادی ان کے عزیزوں میں جناب محمد حسن صدیقی کی صاحبزادی محترمہ سعیدہ بیگم سے ہوئی۔ صدیقی صاحب ہمہ جہت عالم اور صاحب فضل و کمال تھے۔ ''سفر نامہ ہیوگل'' کا اردو ترجمہ

اس کا ثبوت ہے۔ڈاکٹر صاحب نے اپنے انٹرویو میں بتایا تھا کہ:

''میں رسومات کا قائل نہ تھا اس لیے شادی کے وقت میں نے سہرا نہیں باندھا اور نہ ہی گھوڑے پر سوار ہوا۔''

ڈاکٹر صاحب کی بیگم صاحبہ نیک دل، وضع دار اور خلوص و مروت کا پیکر خاتون ہیں۔ڈاکٹر صاحب کے والدین کی خدمت گزاری میں ان کا کردار مثالی رہا۔ڈاکٹر صاحب کے علمی کارناموں کے لیے ساز گار ماحول پیدا کرنے میں ان کی خدمات کا اعتراف ڈاکٹر صاحب خود بھی کرتے ہیں۔انہیں میکے اور سسرال دونوں طرف سے علمی ماحول میسر تھا اور خود اعلیٰ تعلیم یافتہ ہونے کے سبب انہوں نے ان تمام ذمہ داریوں کو محسوس کیا اور ان سے عہدہ برآ ہوئیں جن کی ان سے امید کی جا سکتی تھی۔

ڈاکٹر صاحب کی صاحبزادی نورین جس کو میں نے گودی کی عمر سے دیکھا ہے اور مجھے سگی بیٹیوں کی طرح عزیز ہیں، ڈاکٹر صاحب کو دل و جان سے چاہتی ہیں اور ڈاکٹر صاحب کی محبتوں کا محور ہیں۔نورین سے مخاطب ہوتے ہوئے ڈاکٹر صاحب کی شخصیت دیدنی ہوتی ہے۔روح کی گہرائیوں تک اتری ہوئی محبت ڈاکٹر صاحب کو اپنی عمر اور مقام سے بے نیاز کر دیتی ہے۔

میں نے ڈاکٹر وحید قریشی کی شخصیت کا پوری ربع صدی مطالعہ کیا ہے۔وہ میرے والد نہ سہی والد لطفی ضرور ہیں۔میں انہی کے خوان کرم کا پروردہ ہوں۔

میں ۱۹۵۸ء سے ۱۹۸۳ء تک یعنی ایف اے سے پی ایچ ڈی تک ڈاکٹر صاحب سے بہ حیثیت شاگرد مسلسل وابستہ رہا ہوں۔ڈاکٹر صاحب اس ربع صدی میں میرے لیے مثالی شخصیت تھے۔میں نے زندگی میں جن چند لوگوں کی ذات کو اپنے لیے نمونہ قرار دیا ان میں سے ایک ڈاکٹر صاحب بھی ہیں۔ان پچیس برسوں میں ڈاکٹر صاحب کی شخصیت اور سیرت کے مختلف پہلو میرے سامنے آئے۔بہ حیثیت مدرس، بہ طور استاد، اتالیق اور نگران، بحیثیت محقق اور صاحب علم و دانش۔

ڈاکٹر صاحب کو میں نے کلاس روم میں پڑھاتے دیکھا۔بی اے میں ان سے فارسی پڑھی۔فارسی کی نصابی کتاب وہ صرف متن کے ترجمے کی حد تک پڑھاتے تھے۔دوران تدریس کوئی نئے نکات نہیں اٹھائے جاتے تھے۔شاید ڈاکٹر صاحب اسے ہماری سطح سے اوپر خیال کرتے تھے، مجھے ڈاکٹر صاحب کے علم و فضل کے مدنظر یہ بات عجیب لگتی تھی۔جس پر ایک روز انہوں نے بتایا کہ حافظ محمود شیرانی فارسی ادب کے بے مثالی عالم اور محقق ہونے کے باوجود نصاب کی تدریس میں بے حدست تھے۔حافظ صاحب نصابی کتاب میں اضافی اوراق لگا کر ان پر ہر شعر یا نثری سطر کے سامنے اس کا ترجمہ لکھ لیتے تھے اور پھر کلاس میں متن ترجمے کے ساتھ ساتھ بولتے جاتے تھے اور وضاحت صرف اسی مقام پر ہوتی تھی جہاں کوئی طالب علم سوال یا نکتہ وضاحت اٹھاتا تھا۔مجھے حافظ صاحب کی کلاس میں حاضری کی سعادت

نصیب نہیں ہوئی لیکن ڈاکٹر وحید قریشی صاحب کے بارے میں یاد ہے کہ دوران تدریس ان کی آواز گونج دار، گرج دار اور مرعوب کن ہوتی تھی۔ فارسی اشعار کو بہت عمدگی سے پڑھتے لیکن بیانیہ نثر میں مطلب سمجھاتے تھے۔ ایم اے اردو کی کلاس میں البتہ ان کا طریق کار مختلف تھا۔ وہ ہر مصنف یا موضوع شروع کرنے سے پہلے اس کے ماخذ کا تفصیلی ذکر کرتے اور کلاس کو لکھواتے جاتے تاکہ مفصل مطالعے کے لیے فکر و خیال کے دریچے کھل جائیں۔ ماخذ کی تفصیل کے بعد موضوع کے بارے میں معلومات بیان کی جاتی تھیں یعنی کس کس نے اس موضوع پر کیا کیا لکھا ہے اور لیکچر کے تیسرے مرحلے میں موضوع کے بارے میں ڈاکٹر صاحب کے ذاتی تاثرات اور تحقیق کا نچوڑ ہوتا تھا۔ یہ وہ مرحلہ تھا جہاں محسوس ہوتا تھا کہ کلاس روم میں فرشتہ الہام نے پر پھیلا رکھے ہیں اور کلاس کے ہر طالب علم کی صریر خامہ، نوائے سروش بنی ہوئی ہے۔ علم و فضل کا ایک دریا ہوتا تھا جو اپنی پوری روانی سے تشنگانِ علم کو سیراب کرتا تھا۔ لیکچر کی یادداشتیں اٹھانا آسان نہیں تھا۔ ہاتھ اور بازو لکھتے لکھتے شل ہو جاتے تھے، ڈاکٹر صاحب کی پاٹ دار آواز پورے ہال کو اپنے سحر میں رکھتی تھی اور کسی کو ان کے ٹیمپو (Tempo) کے خلاف سانس لینے کی جرأت بھی نہیں ہوتی تھی۔

ڈاکٹر صاحب کی ذات میرے اور ہر اس طالب علم کے لیے شوق اور وابستگی کی تربیت گاہ تھی جو ادبی مطالعے اور تحقیق سے شغف رکھتا تھا۔ ڈاکٹر صاحب نے میرے اندر ایف اے ہی سے تحقیق کا چسکا ڈال دیا تھا۔ ایف اے کے زمانے میں ''کلمات الشعرا'' کے مصنف محمد افضل سرخوش پر مقالہ لکھنا جنون نہیں تو اور کیا تھا۔ ڈاکٹر صاحب کسی موضوع پر ابتدائی گفتگو میں بھی چالیس پچاس ماخذ سے کم بات نہیں کرتے تھے۔ کتاب کے ساتھ زندگی بسر کرنے کا گر ڈاکٹر وحید قریشی سے زیادہ کوئی نہیں جانتا اور نہ ہی کسی کو سکھا سکتا ہے۔ اپنے پچیس سالہ تجربے کی بنا پر بڑے وثوق سے کہہ سکتا ہوں کہ تحقیقی موضوعات پر ڈاکٹر وحید قریشی سے بہتر کسی استاد رہنما کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔ برعظیم میں فن تحقیق کی اگر کسی روایت کو صحیح معنوں میں دبستان کہا جا سکتا ہے تو وہ ''دبستان لاہور'' ہے جو اپنے بعض امتیازی خصائص کے سبب مثالی اور زندہ جاوید ہے اور اگر میرا یہ موقف درست ہے تو اس میں یہ اضافہ بھی کروں گا کہ ڈاکٹر وحید قریشی کی ذات اور علمی شخصیت نہ صرف اس دبستان کی نمائندہ ہے بلکہ اس روایت کا دور حاضر میں محور و مرکز بھی ہے۔ اگر انہیں دبستان لاہور کی تربیت گاہ کہا جائے تو غلط نہ ہوگا۔ پی ایچ ڈی کی ڈگری کے لیے کسی مقالے کا لکھا جانا اور بات ہے اور ڈاکٹر وحید قریشی کی نگرانی میں کسی تحقیقی منصوبے کا مکمل ہونا اور بات ہے۔ یہ وہ امتیاز ہے جو کام کو وقار ہی نہیں بخشتا اسے دوسروں کے لیے مثالی بھی بناتا ہے۔ کام کی نگرانی اور رہنمائی کے دوران ڈاکٹر صاحب طالب علم پر جس طرح ماخذ اور معلومات کی بارش کرتے ہیں وہ انہی کا حق ہے۔ نگرانی اور رہنمائی کے لیے ڈاکٹر صاحب کا دروازہ ان کے دل کی طرح ہر دوست دشمن

کے لیے کھلا ہے۔ وہ کسی کو علمی مشورہ دیتے ہوئے یہ نہیں دیکھتے کہ وہ شخص کون ہے بلکہ یہ سوچتے ہیں کہ وہ ان سے کیا توقعات لے کر آیا ہے اور وہ اس کے لیے کیا کر سکتے ہیں۔ انہوں نے حافظ محمود شیرانی، ڈاکٹر مولوی محمد شفیع اور ڈاکٹر سید عبداللہ کے بعد تحقیق کی روایت کو نہ صرف آگے بڑھایا اور آئندہ نسلوں میں اسے رواج دیا ہے۔ بلکہ اس فن میں نئی جہتوں کا سراغ بھی لگایا ہے۔ موضوع کے اصلی ماخذوں تک رسائی اور ان سے درست نتائج کا استنباط، یہ ہیں ڈاکٹر صاحب کی تحقیق کے بنیادی اوصاف۔ ایک مرتبہ ڈاکٹر صاحب نے اپنے تحقیقی کام کی مشکلات کا ذکر کرتے ہوئے مجھ سے فرمایا تھا کہ:

> ''اردو اور فارسی کی تحقیق میں اب تک جو بنیادی کام ہونا چاہیے تھا، وہ نہیں ہوا۔ ہر محقق کو خود کنواں کھود کر پانی پینا ہوتا ہے۔ یہ ایک غور طلب مسئلہ ہے۔ جب کہ دوسرے ممالک میں ایسا نہیں۔ مثال کے طور پر یورپ میں آپ دیکھیں ،بالفرض آپ ٹی ایس ایلیٹ یا شیکسپیئر پر کام کر رہے ہیں تو آپ کو نہ صرف فہرست ماخذ مل جائے گی بلکہ ایسی ڈکشنریاں بھی مل جائیں گے جن سے معلوم ہوگا کہ اس منصف نے کون کون سا لفظ کہاں کہاں استعمال کیا ہے۔ اردو اور فارسی میں اس طرح کا کام ابھی نہیں ہوا۔ اس لیے محقق یا نقاد کو یہ کام خود کرنا پڑتا ہے۔ تحقیق میں زیادہ ٹھوکریں وہ لوگ کھاتے ہیں جو صحیح متن سامنے نہیں رکھتے۔ لہذا یہ لازمی ہوجاتا ہے کہ متن کو درست کیا جائے اور پھر اس کے بارے میں نتائج اخذ کیے جائیں۔''

ڈاکٹر صاحب اپنے علمی اور تحقیقی کام کس طرح انجام دیتے ہیں، آخر میں اس کی ایک جھلک بھی دیکھ لیجیے مجھ سے گفتگو کے دوران انہوں نے فرمایا:

> ''صاحب بات یہ ہے کہ میرا بیشتر کام گرمیوں کی دوپہروں کا ہے یا جب کالج میں چھٹیاں ہوتی تھیں۔ سردیوں یا گرمیوں میں لکھنے پڑھنے کا زیادہ تر کام میں نے چھٹیوں ہی میں انجام دیا ہے۔ گرمیوں میں جب گھر میں سناٹا ہوتا یعنی دوپہر میں سب لوگ سو جاتے تو میں پنکھے کے نیچے قمیض اتار کر پاجامہ پہن کر بستر پر بیٹھ جاتا تھا اور اپنی کتابیں پھیلا کر کام کرتا رہتا تھا، یہ میرا طریقہ کار تھا۔''

ڈاکٹر صاحب کے علمی کاموں کی انجام دہی میں ان کے وسیع کتب خانے کا بھی حصہ ہے اور اس عظیم الشان اور بابرکت کتابیاتی خزینے کا بھی، جو ان کے سینے میں محفوظ ہے۔ ڈاکٹر صاحب کے شاگرد اور ارادت مند ان دونوں سے مستفید ہوتے ہیں۔ ڈاکٹر صاحب کا وجود ہماری قومی زندگی اور دنیائے علم و دانش کا ایک نادر روزگار سرمایہ ہے۔ اللہ تعالیٰ اس مینار نور کو ہمیشہ اپنے حفظ و امان میں رکھے۔ (آمین)

حوالے

۱۔ موضع کھیالی کا ایک علم پرور خاندان (غیر مطبوعہ مقالہ)

۲۔ ایضاً شجرہ نسب کی تصحیح ۲، ربیع الاول ۱۳۱۷ھ کے مطبوعہ شجرے سے کی گئی جو سراج المطابع جہلم سے شائع ہوا تھا۔

۳۔ ایضاً

۴۔ مشمولہ کتاب: ''میں اور حالی'' از ڈاکٹر وحید قریشی، لاہور، ۱۹۶۱ء

۵۔ ''مطالعہ حالی''۔

علمی و ادبی خدمات : ایک مصاحبہ

عرصہ پہلے ڈاکٹر وحید قریشی سے ان کی علمی، ادبی اور تحقیقی خدمات کے حوالے سے گفتگو ہوئی تھی۔ اس کا ایک حصہ پیش خدمت ہے:

گوہر نوشاہی: ڈاکٹر صاحب آپ زندگی کے کس حصے میں لکھنے پڑھنے کی طرف راغب ہوئے۔

وحید قریشی: میرا لکھنے کا شوق میٹرک کے فوری بعد شروع ہو گیا تھا۔ جب میں گورنمنٹ کالج لاہور میں زیر تعلیم تھا میں نے لکھنے کا آغاز شعر سے کیا جب میں بی اے کے پہلے سال یعنی تھرڈ ایئر میں تھا تو میری تحریریں رسائل میں شائع ہونے لگی تھیں۔ اس زمانے میں مولانا تاجور نجیب آبادی اور اختر شیرانی کی ادارت میں ''شاہکار'' شائع ہوتا تھا، میری پہلی غزل ۱۹۴۳ء میں اسی جریدے میں شائع ہوئی تھی۔ گورنمنٹ کالج کے جریدے ''راوی'' میں تو میری بہت سی چیزیں شائع ہوئیں کچھ میرے نام سے کچھ دوسروں کے ناموں سے بعض اوقات دوست فرمائش کر کے مجھ سے شعر لے لیتے تھے تا کہ ان کے نام بھی راوی میں چھپ جائیں۔ اس کے بعد ۱۹۴۵ء میں جب میں ایم اے فارسی میں آیا تو میں نے نثر لکھنی شروع کی اسی سال یعنی ۱۹۴۵ء میں ''شبلی کی حیات معاشقہ'' کے زیر عنوان پہلا مقالہ لکھا جو پہلے حلقہ ارباب ذوق میں پڑھا گیا اور پھر کتابی صورت میں شائع ہوا۔

گ۔ن: ڈاکٹر صاحب میرا خیال ہے کہ شبلی والے کام میں آپ ایک محتسب کی حیثیت میں نظر آتے ہیں، تجزیہ نگار اور نقاد نہیں۔

و۔ق: جی ہاں! اس زمانے میں مجھے زیادہ شوق اسی انداز کی تحقیق کا تھا۔

گ۔ن: آپ کو تحقیق اور تنقید، دونوں شعبوں میں اہم مقام حاصل ہے۔ آپ نے ان دونوں میں سے کس کے ساتھ زیادہ انصاف کیا ہے؟

و۔ق: اس کا اندازہ تو قارئین ہی کر سکتے ہیں۔ اس بارے میں کیا کہوں البتہ میں سمجھتا ہوں کہ تحقیق تنقید کے اور تنقید تحقیق کے بغیر مکمل نہیں ہوتی، چنانچہ میری کوشش رہی ہے کہ دونوں کو ساتھ

ساتھ چلاؤں لیکن تحقیق بہت توجہ اور تمرکز حواس چاہتی ہے۔ اتفاق سے میرا تحقیقی کام اس وقت نقطۂ عروج کو پہنچا، جب میں اورینٹل کالج میں آیا اور علمی مشاغل کے ساتھ ساتھ انتظامی امور میں دل چسپی لینا میرے لیے ضروری ہو گیا۔ ۱۹۷۰ء میں یہ معلوم نہیں ہوتا تھا کہ کل نوکری ہے یا نہیں پنجاب یونیورسٹی کی فضا میں اس آلودگی کو محسوس کرتے ہوئے مجھے یونیورسٹی کے انتظامی معاملات میں بھی مداخلت کرنا پڑی۔ یہ گویا میرے لیے ایک بقائے حیات کی جنگ تھی۔ اس صورت حال کے باوجود اگر صاحبان علم و تحقیق کے نزدیک میری خدمات کی کوئی اہمیت ہے تو اس سے میری محنت کا اندازہ کرنا مشکل نہ ہو گا۔

گ۔ن: اردو تحقیق میں سب سے زیادہ کس موضوع سے آپ کی وابستگی رہی۔

و۔ق: جہاں تک اردو تحقیق کا تعلق ہے میری دلچسپی اردو کی وجہ سے مغلوں کے آخری دور سے رہی ہے، تاریخ پنجاب اور تحریک پاکستان بھی میرے مطالعے اور تحقیق کا مستقل حصہ رہے ہیں۔ اردو تحقیق میں سب سے زیادہ کام میں نے میر حسن پر کیا ہے۔ تحقیق میں کوئی چیز حرف آخر نہیں ہوتی کوئی نیا ماخذ مل گیا، کوئی نیا مواد سامنے آ گیا تو اس کی مدد سے اپنے کام پر نظر ثانی تو کرنی ہی پڑتی ہے۔ میر حسن والا کام میرا بنیادی نوعیت کا کام ہے جس سے میری وابستگی سب سے زیادہ رہی۔ فارسی میں میری دل چسپی اس نوعیت کی تھی کہ میں برصغیر پاک و ہند کے فارسی ادب کی ایک تاریخ لکھنا چاہتا تھا۔ اس نقطۂ نظر سے میں مواد جمع کرتا رہا اور میں نے اپنی لائبریری بنائی۔ میری لائبریری ایک ورکنگ لائبریری ہے۔ اس میں تیس ہزار کے قریب کتابیں ہیں لیکن منتخب ہیں میرا اصل میدان شاعری، تاریخ اور تنقید رہا ہے۔ اسی حوالے سے میں نے اپنا کتب خانہ منظم کیا ہے۔

گ۔ن: ڈاکٹر صاحب! تحقیق میں دو رجحانات یا دو رویے نمایاں ہیں۔ ایک سوانحی تحقیق کا اور دوسرا متنی تحقیق کا۔ آپ ان دونوں میں سے کس کو زیادہ اہم سمجھتے ہیں؟

و۔ق: ڈاکٹر صاحب! پہلے میں تمہیداً ایک بات عرض کر دوں کہ اردو اور فارسی میں اب تک جو بنیادی کام اس سلسلے میں ہونا چاہیے وہ نہیں ہو پایا۔ ہر محقق کو خود کنواں کھود کر پانی پینا پڑتا ہے۔ یہ ایک غور طلب مسئلہ ہے۔ دوسرے ممالک کے محققین شاید اس صورت حال سے دوچار نہیں ہیں۔ مثلاً آپ یورپ میں دیکھیں آپ اگر ٹی ایس ایلیٹ پر کام کر رہے ہیں تو آپ کو اپنے موضوع سے متعلق بنی بنائی تیار فہرست ماخذ مل جائے گی۔ اردو اور فارسی میں ابھی تک اس طرح کا کوئی منظم اور جامع کام نہیں ہوا، اسی لیے ہر محقق کو یہ کام خود کرنا پڑتا ہے۔ تنقید میں زیادہ ٹھوکریں وہ لوگ کھاتے ہیں جو صحیح متن سامنے نہیں رکھتے۔ متنی

نقاد اور متنی محقق کے لیے لازمی ہو جاتا ہے کہ وہ پہلے متن کو صحیح کرے اور پھر اس سے صحیح نتائج اخذ کرے۔ ایک زمانے تک لوگ سمجھتے رہے کہ غالب نے ''خموش ہے، نیوش ہے'' والی غزل ۱۸۵۷ء کے بعد لکھی لیکن آج ساری دنیا جانتی ہے کہ یہ غزل تو اس کی جوانی کے زمانے کی ہے یعنی جنگ آزادی سے پچیس سال پہلے کی چنانچہ اس سے جو نتائج اخذ کیے گئے وہ غلط تھے۔

گ۔ن: سوانحی تحقیق اور متنی تحقیق میں سے مشکل کام کون سا ہے؟

و۔ق: میں سمجھتا ہوں متنی تحقیق زیادہ مشکل ہے۔ اب تک جو متن ہمارے یہاں شائع ہوئے ہیں ان میں سے زیادہ سے زیادہ دس فیصد ہیں جو صحیح ہوں گے یا جن میں صحیح ماخذ کو پیش نظر رکھتے ہوئے متن کی صحت کا اہتمام کیا گیا ہوگا۔

گ۔ن: متنی تحقیق کے لیے غیر معمولی محنت بھی تو درکار ہے؟

و۔ق: جی ہاں غیر معمولی محنت چاہیے۔ میر تقی میر کا اب تک ڈھنگ کا کوئی متن آپ کو دستیاب نہیں۔ کلب علی خان فائق کا متن صرف مطبوعہ نسخوں کو سامنے رکھ کر تیار کیا گیا۔ اسے تحقیقی متن نہیں کہا جاسکتا جہاں تک متن سازی کا تعلق میں نے فارسی اور اردو دونوں میں یہ کام کیا ہے۔ میرا مرتب کیا ہوا اردو متن دیوان جہاندار شاہ اور '' فارسی متن'' تذکرہ ہمیشہ بہار صحت متن کی دو اچھی مثالیں ہیں۔

گ۔ن: ڈاکٹر صاحب آپ نے ایک مثالی متن ''عمل صالح'' شاہجہان نامہ کا بھی تیار کیا ہے؟

و۔ق: عمل صالح کا متن آپ کے سامنے ہے پہلے مرتب نے اس میں کام کی گنجائش بہت کم چھوڑی تھی لیکن میں نے اس میں اپنے لیے گنجائش پیدا کی چنانچہ آپ دیکھیں گے کہ دونوں میں نمایاں فرق موجود ہے۔ مثال کے طور پر عمل صالح میں کوتوال کے ذکر میں لکھا ہے'' چار زدہ'' اور آگے پشاور کا تذکرہ ہے۔ پہلے مرتب نے اسے '' چارسدہ'' پڑھا تھا۔ مجھے حیرت اس پر تھی کہ پشاور کہاں اور چارسدہ کہاں؟ اس کے معنی سوچتے سوچتے اس نتیجے پر پہنچا کہ یہ افغانی فارسی ہے اور یہ لفظ '' چار زدن'' نہیں بلکہ جارزدن ہے یعنی ڈھنڈورا پٹوانا گویا مصنف یہ کہہ رہا ہے کہ اشرف کوتوال نے ڈھنڈورا پٹوایا۔

گ۔ن: ڈاکٹر صاحب! آپ نے جو علمی کام انجام دیئے ان کی تکمیل میں آپ کے گھر کے ماحول نے آپ کا کتنا ساتھ دیا؟

و۔ق: ڈاکٹر صاحب! بات یہ ہے کہ میرا بیشتر کام گرمیوں کی دوپہروں کا ہے یا جب کالج میں چھٹیاں ہوتی تھیں۔ سردیوں میں یا گرمیوں میں لکھنے پڑھنے کا زیادہ کام میں نے چھٹیوں

میں انجام دیا ہے۔ عموماً دوپہر میں جب سب لوگ سو جاتے اور گھر میں سناٹا ہوتا تو میں قمیض اتار کر اور پاجامہ پہن کر پنکھے کے نیچے بیٹھ جاتا تھا اور اپنی کتابیں پھیلا کر کام کرتا رہتا تھا، یہی میرا طریق کار تھا، میں اپنی زندگی میں وقت کا بہت پابند رہا ہوں۔ آپ بھی میرے شاگرد رہے ہیں۔ آپ کو یاد ہوگا، میری کوشش ہوتی تھی کہ میں کلاس میں کبھی ناغہ نہ کروں اور نہ کبھی دیر سے پہنچوں۔ اس عادت نے بھی میرے علمی کاموں کی تکمیل میں میری مدد کی اور میں نے جو کام شروع کیا اسے عموماً وقت پر ختم کیا۔

گ۔ن: ڈاکٹر صاحب آپ نے جن اساتذہ سے کسب فیض کیا ان میں سے کس کس کی یاد تازہ کرنا چاہیں گے؟

و۔ق: جہاں تک میرے اساتذہ کا تعلق ہے ان سب کا میں احترام کرتا ہوں اور انہیں اپنے سے ہر لحاظ سے برتر سمجھتا ہوں۔ میرے پسندیدہ استادوں میں ڈاکٹر سید عبداللہ، سید عابد علی عابد، صوفی غلام مصطفےٰ تبسم، پروفیسر عباس شوستری اور مولانا علم الدین سالک قابل ذکر ہیں۔ ڈاکٹر سید عبداللہ نے نہ صرف تحقیق کے کئی رموز غوامض سے آگاہ کیا بلکہ تذکروں کے عمیق مطالعے اور ان سے بہرہ برداری کا سلیقہ بھی سمجھایا۔ مولانا علم الدین سالک سے میں نے بہت استفادہ کیا۔ میں سمجھتا ہوں تاریخ کا صحیح ذوق مجھے سالک صاحب سے عطا ہوا۔ مولانا سالک نے تحریری کام بہت کم کیا ہے اور جو کچھ موجود ہے وہ بھی بکھرا ہوا ہے وہ بنیادی طور پر فارسی اور اردو کے استاد تھے اس لیے تاریخ والوں نے انہیں اہمیت نہیں دی لیکن یہ بات پورے وثوق سے کہی جاسکتی ہے کہ پنجاب کی تاریخ، مغلوں کی تاریخ اور تاریخ کشمیر پر مولانا علم الدین سالک سند کا درجہ رکھتے تھے۔ فارسی زبان وادب اور بالخصوص شعر کا ذوق مجھے صوفی تبسم سے عطا ہوا۔ سید عابد علی عابد کی نظر اصول تنقید پر بہت گہری تھی۔ تجزیہ وتحلیل کے سلسلے میں ان کے ذہن میں کوئی ابہام نہ تھا۔ اتنے ذہن رسا کا مالک اپنے معاصرین میں شاید ہی مجھے کوئی دوسرا شخص نظر آیا ہو۔ وہ جس موضوع کو پڑھاتے تھے۔ اس کی پوری تیاری کر کے آتے تھے۔ مجھے یاد ہے، ایم۔اے کے زمانے میں ایک دن کلاس میں آئے اور کہنے لگے، آج نہیں پڑھاؤں گا۔ میں نے بعد میں اس کا سبب دریافت کیا تو کہا آج میں پوری طرح تیار ہو کر نہیں آیا تھا۔ پروفیسر عباس شوستری سے میں نے سبقاً چھ مہینے زبان بھی پڑھی ہے۔ پروفیسر شوستری ایرانی تھے اور بہت عمدہ فارسی بولتے تھے۔ میرے پی ایچ ڈی (فارسی) کے استاد راہنما بھی وہی تھے۔ شوستری صاحب کے بچے کچھ ایران میں تھے اور کچھ غالباً حیدر آباد دکن میں۔ وہ اکیلے یہاں رہتے تھے۔ کالج ہوسٹل میں وہ اکثر میرے

کمرے میں تشریف لے آتے تھے اور تقاضا کرتے تھے کہ میں اردو میں بات کروں گا اور تم فارسی میں جواب دو گے۔ اس طرح انہوں نے مجھے فارسی کی مشق کرائی۔ اس زمانے میں بڑی روانی سے فارسی بول لیتا تھا۔ میرے غیر رسمی اساتذہ میں دو نام اور بھی اہم ہیں۔ ایک مولانا فیوض الرحمٰن کا، جن سے میں نے سبقاً علم معانی پڑھا اور دوسرے مولوی محمد شفیع جن سے میں نے تحقیق میں بہت کچھ سیکھا۔

منتخب کلام

حمد

سب پہ ہے تیرا کرم اور بے طلب
اے مرے رب، اے مرے دشمن کے رب
تیری رحمت دشت و دریا کو محیط
دشت و دریا سے ورا میری طلب

غزل

بیچ منجدھار بہہ رہا ہوں میں
تیرتا ہوں کہ ڈوبتا ہوں میں

وقت تھم سا گیا ہے آخر شب
سو رہا ہوں کہ جاگتا ہوں میں

دن کو دشت و جبل میں سرگرداں
رات گلیوں میں گھومتا ہوں میں

کون آئے گا کس کو آنا تھا
اب تو سو جاؤں تھک گیا ہوں میں

اپنے دل کی اداسیوں میں تجھے
بن کے دیوانہ دیکھتا ہوں میں

پاؤں لگتے نہیں زمیں پہ مرے
خواب میں جیسے چل رہا ہوں میں

چاند چھپ چھپ کے دیکھتا ہے مجھے
چاند کو چھپ کے دیکھتا ہوں میں

کن ہواؤں کے دوش پر شب ہجر
ہر دریچے سے جھانکتا ہوں میں

شبِ تاریک، آندھیاں، نوحے
یوں لگا جیسے مر گیا ہوں میں

غزل

سامع کے بغیر شاعری کیا
تالی کے بغیر زندگی کیا

تھے اپنی ہی سوچ کے کرشمے
کیا نیکی ہے اور ہے بدی کیا

آنکھوں میں رقابتوں کے طوفاں
چہرے پہ نقابِ دوستی کیا

فاقوں میں کٹے گی عمر ساری
کام آئے گی یہ قلندری کیا

سب اپنے ضمیر کے شکاری
اندھیر نگر کی چاکری کیا

بے سود ہے تیری شعر گوئی
اندھوں کے لیے مصوری کیا

غفلت کے مزے اٹھانے والے
کھائیں گے فریب آگہی کیا

سب کھوٹے کھرے ہوئے برابر
رہزن ہوئے ہم تو رہبری کیا

دل کان لگا کے سُن رہا ہے
نیرو نے بجائی بانسری کیا

گلشن میں سکوتِ مرگ طاری
چٹکے گی خیال کی کلی کیا

آزادیٔ فکر کے خداؤ
روزن ہی نہیں، تو روشنی کیا

تم شِعر سُنا رہے ہو کِس کو
بِنوں میں مذاقِ شاعری کیا

بادل کا ٹکڑا

بادل کا ٹکڑا
کِس کِس پہ برسے
نکلا ہے گھر سے

گلشن سے گزرا
کلیوں نے روکا
شاخوں نے ٹوکا

سونی پڑی ہے
صحرا کی دھرتی
کیوں کر سنورتی

سب دشت و صحرا
پھیلے کے پھیلے
میلے کے میلے

بادل کا ٹکڑا
کس کس پہ برسے
نکلا ہے گھر سے

دوہے

(۱)

سدا کی روگی روشنی، من مندر ویران
رات ڈراؤنی خواب سی، جیون بھوت استھان

(۲)

چاند کا پنچھی سو گیا ، لمبی چادر تان
گلیاں شہر لہور کی ، سونی اور سنسان

(۳)

اپنا آپ مٹائے کے ، ملے کہاں سے گیان
کچے گھڑے پر تیر کے مفت گنوائی جان

(۴)

اک بالک کے ہاتھ میں آیا تیر کمان
عشق نہ پوچھے ذات کو، عشق نہ دیکھے جان

پنجابی غزل

پھوکے شعر سناندا جا
ٹوٹے توپ چلاندا جا

گل وچ رسی پاندا جا
باندر وانگ نچاندا جا

روزے رکھن دشمن تیرے
توں پیپے کھڑکاندا جا

دھوکے دی منڈی اے بیبا
سب نوں ٹُھگے لاندا جا

بن جا چاکر ہر حاکم دا
یا فیر دھکّے کھاندا جا

شاہ دولہ دے چوھے

دوروں عقل دے بھتم سیہاپن
میرے ملک دے وڈے لوک
جاں میں نیڑے ہو کے ڈٹھا
شاہ دولہ دے چوہے لوک

تصانیف

اردو کتب

۱۔ **شبلی کی حیات معاشقہ** (نفسیاتی مطالعہ): مکتبہ جدید، لاہور۔۱۹۵۰ء

اس سے قبل یہ مقالہ درج ذیل رسائل میں شائع ہوا:

۱۔ کتاب لاہور، اپریل ۱۹۴۵ء ۲۔ ادبی دنیا لاہور، جون ۱۹۴۸ء

۳۔ روزنامہ احسان، لاہور ۱۹۴۹ء

۲۔ **میر حسن اور ان کا زمانہ**: اردو بک اسٹال، لاہور۔۱۹۵۹ئ مقالہ برائے ڈیلٹ (اردو) جامعہ پنجاب، لاہور

۳۔ **مطالعہ حالی** : (مجموعہ مقالات) طبع اول: اردو بک اسٹال، لاہور۔۱۹۶۱ء بہ ترمیم و اضافہ طبع دوم: دارالادت، لاہور۔۱۹۶۶ء

مشمولات: ۱۔ میں اور حالی ۲۔ حالی دتی میں ۳۔ حالی کی تنقید ۴۔ یادگار غالب ۵۔ حالی کی غزل گوئی (صرف طبع دوم میں)۔

۴۔ **کلاسیکی ادب کا تحقیقی مطالعہ**: (مجموعہ مقالات) مکتبہ ادب جدید، لاہور ۱۹۶۵ء

مشمولات: ۱۔ مثنوی چندر بدن ماہیار ۲۔ لکھنو کا دبستان شاعری ۳۔ مصحفی اور اس کا کلام ۴۔ میر شیر علی افسوس ۵۔ سید حیدر بخش حیدری ۶۔ میر بہادر علی حسینی ۷۔ قاضی سراج الدین احمد ۸۔ یادگار غالب ۹۔ علامہ اقبال کی تعلیمی زندگی کی بعض تفصیلات ۱۰۔ علامہ اقبال اور اسلامیہ کالج۔

۵۔ **تنقیدی مطالعے**: (مجموعہ مقالات) کاروان پریس، لاہور۔ ۱۹۶۷ء

مشمولات: ۱۔ سودا کی مجروح شخصیت ۲۔ سودا کی غزل گوئی ۳۔ میر حسن کی غزل گوئی ۴۔ آتش کی غزل گوئی ۵۔ اکبر اور نئی علامت ۶۔ اقبال کی شاعری ۷۔ فیضی کا نظریہ شعر ۸۔ غالب کا نظریہ شعر ۹۔ اردو تنقید سنہ ستاون سے پہلے ۱۰۔ تنقید روایت ۱۱۔ حالی کی تنقید ۱۲۔ انشائی ادب ۱۳۔ خسرو کا نظریہ اسلوب ۱۴۔ قدیم نظریہ اسلوب۔

۶۔ **باغ و بہار ایک تجزیہ**: طبع اول: سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور۔ ۱۹۶۸ء، طبع دوم: نصرت پبلشرز، لکھنو۔ ۱۹۸۲ء

۷۔ **نذر غالب**: (مجموعہ مقالات) سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور۔ طبع اول، ۱۹۷۰ء۔ طبع دوم (ٹائپ میں) ۱۹۷۰ء

مشمولات: ۱۔ عہد ابوظفر بہادر شاہ ۲۔ غالب اور نسخہ شیرانی ۳۔ پنجاب یونیورسٹی کے دو گلدستے اور تلامذہ غالب ۴۔ یادگار غالب ۵۔ غالب اور اس کا ماحول ۶۔ غالب کا ایک شعر ۷۔ غالب کا ایک اور شعر ۸۔ غالب کا نظریہ شعر۔

۸۔ **اردو نثر کے میلانات**: (مجموعہ مقالات) مکتبہ عالیہ، لاہور۔ ۱۹۸۶ء

مشمولات: پیش لفظ (از ڈاکٹر سلیم اختر) ۱۔ اردو ادب ۱۹۵۷ء سے ۱۹۶۶ء تک ۲۔ اردو ادب میں مزاح نگاری ۳۔ مولوی نذیر احمد کی یاد میں ۴۔ انتقاد کی مختصر تاریخ ۵۔ جدید اردو ادب کے سنگ میل ۶۔ اردو ادب میں نفسیاتی انداز فکر ۷۔ نفسیاتی تنقید ۸۔ ہمارے ادب کا نیا دور: ۱۹۶۵ء کا پاکستانی ادب ۹۔ مولانا محمد حسین آزاد کا نقاد: صلاح الدین احمد ۱۰۔ خلیفہ عبدالحکیم: ایک نقاد ۱۱۔ ممتاز حسین: ایک نقاد۔

۹۔ **مقالات تحقیق**: (مجموعہ مقالات) مغربی پاکستان اردو اکیڈمی، لاہور۔ ۱۹۸۸ء

مشمولات: ۱۔ پاکستان میں اردو تحقیق کے دس سال ۱۹۵۸ء تا ۱۹۶۸ء ۔ پنجاب یونیورسٹی کا ایک تحقیقی مقالہ ۳۔ مثنوی کدم راؤ پدم راؤ ۴۔ دیوان شوقی: ایک جائزہ ۵۔ حالات حسن کے دو ماخذ ۶۔ سحر البیان کا ایک نادر قلمی نسخہ ۷۔ میر حسن اور سحر البیان ۸۔ خوان نعمت: ایک محاکمہ ۹۔ مقدمہ مثنویات میر حسن ۱۰۔ جہاندار شاہ ۱۱۔ مقدمہ کلام آتش: ایک جائزہ ۱۲۔ گلستان سخن: ایک تجزیہ ۱۳۔ بنیادی اردو: ایک تجزیہ ۱۴۔ حوالہ جات قانون فون داری پر ایک طائرانہ نظر ۱۵۔ مشرق میں فہرست سازی کی روایت ۱۶۔ کتابیات تحقیق و تنقید ۱۷۔ کتاب نامہ شبلی پر ایک نظر ۱۸۔ فن تاریخ گوئی۔

۱۰۔ **جدیدیت کی تلاش میں**: (مجموعہ مقالات) مقبول اکیڈمی، لاہور۔۱۹۹۰ء

مشمولات: ۱۔نظیر اکبر آبادی ۲۔اکبرالہ آبادی کی ظرافت ۳۔مولانا محمد علی جوہر کی شاعری ۴۔مضطر خیر آبادی ۵۔اختر حیدر آبادی ۶۔بہزاد لکھنوی ۷۔ندرت میرٹھی ۸۔فاخر ہریانوی ۹۔ملک منظور حسین منظور ۱۰۔ضمیر کی آواز ۱۱۔عبدالحمید عدم ۱۲۔نعیم صدیقی: ایک تعارف ۱۳۔حبیب جالب کی شاعری ۱۴۔طفیل ہوشیار پوری ۱۵۔مخمور جالندھری ۱۶۔قتیل شفائی ۱۷۔غبار تمنا کا شاعر ۱۸۔الطاف پرواز ۱۹۔اکبر کاظمی کی ملی شاعری ۲۰۔رفعت سلطان کی غزل ۲۱۔راسخ عرفانی اور اصلاح شعری روایت ۲۲۔سلیم گیلانی کی نعتیہ شاعری ۲۳۔'گرد سفر' کا شاعر ۲۴۔ڈاکٹر افضل اقبال: کتاب کے آئینے میں ۲۵۔شہاب دہلوی کا مجموعہ کلام ۲۶۔جدید شعر ۲۷۔شعرا کا تجزیاتی مطالعہ سید فیضی ۲۸۔مختار صدیقی ۲۹۔فکر تونسوی ۳۰۔ضیاء جالندھری ۳۱۔ظہیر کاشمیری ۳۲۔قتیل شفائی ۳۳۔ساحر لدھیانوی ۳۴۔عارف عبدالمتین ۳۵۔مجید امجد ۳۶۔جابر علی سید ۳۷۔منیب الرحمٰن ۳۸۔عزیز حامد مدنی ۳۹۔کرشن موہن ۴۰۔جمیل واسطی ۴۱۔نریش کمار شاد ۴۲۔مبارک احمد ۴۳۔ناصر کاظمی ۴۴۔احمد راہی ۴۵۔م۔حسن لطیفی اور نئی لسانی تشکیلات ۴۶۔میراجی کی پابند شاعری ۴۷۔مجید امجد کی شاعری ۴۸۔مدنی کی شاعری ۴۹۔'نقش کف پا' کا شاعر ۵۰۔پروین فنا سید اور تمنا کا دوسرا مقام ۵۱۔امجد اسلام امجد خوابوں کا شاعر ۵۲۔سورج کی آنکھ ۵۳۔پرواز عقاب ۵۴۔پاتال کے دیوتا ۵۵۔اردو غزل کی نئی روایت اور نذیر قیصر ۵۶۔عالی کے دو روپ ۵۷۔فراق کی غزل ۵۸۔انجم رومانی کی غزل ۵۹۔جدید غزل کے محاکات۔

۱۱۔ **افسانوی ادب**: (مجموعہ مقالاب) مقبول اکیڈمی، لاہور۔۱۹۹۳ء

مشمولات: ۱۔میر امن (باغ و بہار) ۲۔حیدر بخش حیدری (طوطا کہانی) ۳۔میر بہادر علی حسینی (اخلاق ہندی) ۴۔حکیم احمد شجاع (باپ کا گناہ، حسن کی قیمت، انوکھا دیوتا) ۵۔میرزا ادیب (فیصل، شب خاک نشیں، حسرت تعمیر، مٹی کا دیا) ۶۔ابصار عبدالعلی (کیسے کیسے لوگ، شاہ رگ) ۷۔خان فضل الرحمٰن خاں (آفت کا ٹکڑا، ادھ کھایا امرود) ۸۔جان ماسٹرز (بھوانی جنکشن) ۹۔عنایت اللہ (منزل منزل دل بھٹکے گا) ۱۰۔مسعود مفتی (محدب شیشہ) ۱۱۔سائرہ ہاشمی (درد کی رت) ۱۲۔ذکاء الرحمٰن (دود چراغ محفل) ۱۳۔منصور قیصر (بے چراغ بستی) ۱۴۔صدیق سالک (پریشر ککر) ۱۵۔منشا یاد کا ایک خاص پہلو ۱۶۔عرش صدیقی (باہر کفن سے پاؤں) ۱۷۔رفیق چودھری ۱۸۔ڈاکٹر احراز نقوی (۱۹۶۴ء

کے منتخب افسانے) ۱۹۔ محمد حسین آزاد (اردو کی پہلی کتاب) ۲۰۔ وحید قیصر (پھول رانی)
۲۱۔ بیگم ثاقبہ رحیم الدین کی دو کتابیں ۲۲۔ بچوں کا ادب۔

اقبالیات

۱۲۔ **اقبال اور پاکستانی قومیت**: (مجموعہ مقالات) مکتبہ عالیہ، لاہور۔ ۱۹۷۷ء

مشمولات: ۱۔ مسند خلافت یا مجلس قانون ساز، فکر، اقبال کی روشنی میں
۲۔ اقبال اور نظریہ وطنیت ۳۔ پاکستان میں قومیت کی تشکیل۔

۱۳۔ **اساسیات اقبال**: (مجموعہ مقالات) اقبال اکادمی پاکستان، لاہور۔ ۱۹۹۶ء

مشمولات: دیباچہ ۱۔ مسند خلافت یا مجلس قانون ساز ۲۔ علامہ اقبال کا تصور حریت ۳۔ وطنیت اقبال اور نظریہ وطنیت ۴۔ علامہ اقبال کا تصور وطنیت ۵۔ اقبال، خمینی اور شریعتی ۶۔ اقبال کا تصور تعلیم اور عصری صورت حال (حصہ اول) ۷۔ اقبال کا تصور تعلیم اور عصری صورت حال (حصہ دوم) ۸۔ علامہ اقبال اور مطالعہ تاریخ ۹۔ اقبال کی شاعری ۱۰۔ اقبال کا اثر دوسرے شعرا پر ۱۱۔ اقبال اور چغتائی ۱۲۔ اقبال کا تصور جہاد ۱۳۔ تفہیم اقبال کے لیے فارسی زبان کی اہمیت ۱۴۔ تشبیہات اقبال (تعارف) ۱۵۔ خطبات اقبال پر ایک نظر (تبصرہ) ۱۶۔ مظلوم اقبال (تبصرہ) ۱۷۔ اقبال کی ابتدائی زندگی ۱۸۔ شذرات فکر اقبال۔

فارسی کتب

غیر مطبوعہ

INSHA LITERATURER IN PERSIAN - A CRITICAL STUDY

مقالہ برائے پی ایچ ڈی، فارسی: نگران: ڈاکٹر سید عبداللہ اور عباس شوستری جامعہ پنجاب، لاہور۔

۱۵۔ Oriental Studies: (مجموعہ مقالات) زریں بک ایجنسی، لاہور۔ ۱۹۶۹ء

مشمولات:

1. The Indian Persian
2. A Survey of Punjabi Language and Literature

3. Folk Romances of Pakistan - Sassi-Punnun
4. A Document of the Sikh Period
5. Gujranwala: Past and Present
6. The Problems of Exhibiting Oriental Manuscripts in the Musemums.

۱۶۔ **مطالعہ ادبیات فارسی** (مجموعہ مقالات) یونیورسٹی اورینٹل کالج لاہور۔۱۹۹۶ء
مشمولات: پہلی بات (از ڈاکٹر ظہور احمد اظہر) ا۔ پاک و ہند میں فارسی زبان و ادب کا ابتدائی دور ۲۔ 'مثنوی معنوی' کی سرگزشت برصغیر پاک و ہند میں ۳۔ امیر خسرو کا صوفیانہ ماحول ۴۔ امیر خسرو کا نظریہ اسلوب ۵۔ پیر کلیر اور ان کا فارسی دیوان ۶۔ فیضی کا نظریہ شعر ۷۔ مقدمہ ''شاہجہان نامہ'' ۸۔ ملا احمد ٹھٹھوی ۹۔ خان آرزو ۱۰۔ غلام علی آزاد بلگرامی اور ان کی ''مآثر الکرام'' ۱۱۔ ٹیک چند بہار ۱۲۔ ''تذکرہ ہمیشہ بہار'' اور کشن چند اخلاص ۱۳۔ مرزا محمد حسن قتیل: احوال و آثار ۱۴۔ آدینہ بیگ خان ۱۵۔ ''تنقید شعر العجم'' پر ایک نظر ۱۶۔ پاکستان میں تدریس فارسی ۱۷۔ ''فعل مضارع'': ایک جائزہ ۱۸۔ ''تنبیہ الغافلین'' پر ایک نظر ۱۹۔ فرہنگ نامہ جدید ۲۰۔ شرح غزلیات غالب: ایک جائزہ ۲۱۔ کلام عرشی: ایک جائزہ ۲۲۔ ''مکتوبات سعیدیہ'': ایک جائزہ ۲۳۔ ''تذکرہ شاہ دولہ دریائی'': ایک جائزہ ۲۴۔ لطف علی بیگ آذر اور ''آتش کدہ'' ۲۵۔ شیخ سعدی کا ایک قطعہ ۲۶۔ جدید فارسی شاعری میں اوزان کے تجربے ۲۷۔ جدید فارسی شاعری ۲۸۔ The Indian Persian

تاریخ

۱۷۔ **پاکستان کی نظریاتی بنیادیں**: ایجوکیشنل امپوریم، لاہور۔۱۹۷۳ء
مشمولات: ا۔ فکری اور سماجی بنیادیں ۲۔ نظریاتی بنیادی اور اقبال ۳۔ نظریاتی بنیادی اور قائداعظم ۴۔ نظریاتی بنیادیں اور قرارداد پاکستان ۵۔ نظریاتی بنیادیں اور مشرقی پاکستان ۶۔ نظریاتی بنیادی اور ہمارا آئین ۷۔ (ضمیمہ) قائداعظم اور ہمارا تاریخی سرمایہ۔

۱۸۔ **قائداعظم اور تحریک پاکستان**: (مجموعہ مقالات) مکتبہ عالیہ، لاہور۔۱۹۸۰ء
مشمولات: ا۔ قائداعظم کی ذات اور ہمارا تاریخی سرمایہ ۲۔ قائداعظم اور مطالعہ پاکستان کی نظریاتی بنیادیں ۳۔ قائداعظم اور وفاقی طرز حکومت ۴۔ قرارداد لاہور پس منظر و

پیش منظر ۵۔قائداعظم اور تقسیم برصغیر ۶۔قائداعظم کی پاکستانی سوانح عمریاں

۱۹۔ Ideological Foundations of Pakistan: عزیز پبلشرز لاہور۔۱۹۸۲ء
طبع دوم: اسلامک بک فاؤنڈیشن، لاہور۔۱۹۸۷ء
یہ ''پاکستان کی نظریاتی بنیادیں'' کا انگریزی ترجمہ ہے۔اس میں مذکورہ کتاب کے پہلے چھ مضامین کا ترجمہ شامل ہے۔

۲۰۔ **پاکستانی قومیت کی تشکیل نو** اور دوسرے مضامین: سنگ میل پبلیکیشنز، لاہور، ۱۹۸۴ء
مشمولات: مقدمہ ا۔تعلیم: قرآن حکیم کی روشنی میں ۲۔تعلیم میں آزادی رائے کا مسئلہ ۳۔ہمارا نظام تعلیم ۴۔مشرقی زبانیں اور تعلیمی اصطلاحات ۵۔امدادی کتب کا مسئلہ ۶۔ پاکستانی قومیت کی تشکیل ۷۔ اردو بحیثیت قومی زبان
۸۔اردو: دفتری زبان ۹۔پنجابی، اردو کے لسانی اور تہذیبی رابطے ۱۰۔اسلام میں قانون کے احترام کا تصور ۱۲۔ادیب اور ہمارا موجودہ معاشرہ ۱۳۔مصنف، تصانیف اور تحریر ۱۴۔پاکستان میں اردو نثر کے بیس برس ۱۵۔پاکستان میں طنز و مزاح کے بیس برس ۱۶۔ پاکستان میں اردو ادب، فنون لطیفہ اور اسلام

تعلیمی کتب

۲۱۔ **پمفلٹ قرآن حکیم کی روشنی میں تعلیم**: آل پاکستان ایجوکیشنل کانفرنس، لاہور ۱۹۷۵ء

۲۲۔ **دفتری اردو**: (پمفلٹ ۱۷) مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد۔۱۹۸۵ء

۲۳۔ **قومی زبان اور ہمارا قومی تشخص**: (پمفلٹ ۳۰)، ایضاً ۱۹۸۶ء

۲۴۔ **اردو بحیثیت قومی زبان**: (پمفلٹ)، ایضاً، ۱۹۸۷ء

۲۵۔ **تحریک پاکستان کے ثقافتی عوامل** (فنون اور قومی زبان) پمفلٹ ۶۵) ایضاً، ۱۹۸۷ء

۲۶۔ **ہمارا نظام تعلیم اور قومی زبان**: ایضاً۔۱۹۸۷ء

شعری مجموعے

۲۷۔ **نقد جاں**: سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور۔ ۱۹۶۸ء

۲۸۔ **الواح**: (اردو، پنجابی) قرطاس، فیل آباد۔ اگست ۱۹۸۴ء

۲۹۔ **ڈھلتی عمر کے نوحے**: ۱۹۹۶ء سورج پبلی کیشنز، لاہور

درسیات

۳۰۔ **جدید ترجمہ فا[illegible]ی**: بہ اشتراک: پروفیسر اسرار احمد خان۔ شاہ برادرز، گجرانوالہ، ۱۹۵۵ء

۳۱۔ **قواعد و انشاء**: (برائے جماعت ششم) بہ اشتراک: محمد اسلم کمبوہ، سید نظیر الحسنین جعفری) طبع اول، لاہور اکیڈمی، لاہور برائے پنجاب ٹیکسٹ بک بورڈ، لاہور، ۱۹۷۷ء

۳۲۔ **قواعد و انشاء**: (برائے جماعت ہفتم) طبع اول: (بہ اشتراک: ڈاکٹر خواجہ محمد زکریا، پروفیسر مرزا مقبول بیگ بدخشانی) مقبول اکیڈمی، لاہور برائے پنجاب ٹیکسٹ بک بورڈ، لاہور۔ ۱۹۷۷ء

۳۳۔ **قواعد و انشاء** (برائے جماعت ہشتم) طبع اول: (بہ اشتراک: پروفیسر شریف کنجاہی، پروفیسر قیوم نظر) اظہار سنز، لاہور۔ برائے پنجاب ٹیکسٹ بک بورڈ، لاہور۔ ۱۹۷۷ء

ترتیب و تدوین

اردو ادب

۳۴۔ **مقدمہ شعر و شاعری**: از الطاف حسین حالی (تدوین و مقدمہ و تحشیہ مکتبہ جدید، لاہور۔ ۱۹۵۳ء طبع دوم (صرف متن): ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ۔ ۱۹۷۶ء (ایضاً) طبع سوم: ایضاً ۱۹۹۵ء (مرتب کی درج ذیل تحریریں اس میں شامل ہیں۔ ۱۔ متفرقات ۲۔ حالی کی شخصیت ۳۔ حالی کی تنقید)

۳۵۔ **دیوان سودا (انتخاب)**: از مرزا محمد رفیع سودا۔ ترتیب مع مقدمہ، بک لینڈ،

لاہور۔ ۱۹۵۷ء مرتب کا مقالہ ''سودا کی غزل گوئی'' بطور مقدمہ شامل ہے۔

۳۶۔ **پنجاب میں اردو**: از حافظ محمود شیرانی: (ترتیب و تحشیہ) کتاب نما، لاہور (کتاب کی تیسری طباعت) ۱۹۶۳ء طبع دوم: آئینہ ادب، لاہور۔ (کتاب کی چوتھی اشاعت) ۱۹۷۱ء

۳۷۔ **اردو کا بہترین انشائی ادب، رجب علی بیگ سرور سے دور حاضر تک**: (ترتیب و مقدمہ) میری لائبریری، لاہور۔ بار اول: ۱۹۴۶ء ایضاً، بار دوم: ۱۹۷۱ء ایضاً، بار سوم: ۱۹۷۸ء ایضاً، بار چہارم: ۱۹۸۸ء
مرتب کا مقالہ ''انشائی ادب'' بطور مقدمہ شامل ہے۔

۳۸۔ **دیوان آتش (انتخاب) تجزیہ اور تنقید**: از خواجہ حیدر علی آتش: ترتیب و مقدمہ میری لائبریری، لاہور۔ بار اول: ۱۹۶۴ء ایضاً بار دوم: ۱۹۶۶ء ایضاً بار سوم: ۱۹۷۷ء ایضاً بار چہارم: ۱۹۷۷ء
مرتب کا مقالہ ''آتش کی غزل گوئی'' بطور مقدمہ شامل ہے۔ حصہ اول میں ڈاکٹر وحید قریشی کا مقدمہ اور مرتبہ انتخاب جبکہ حصہ دوم میں مولانا حسرت موہانی کا مرتبہ انتخاب شامل کیا گیا ہے۔

۳۹۔ **مثنوی سحر البیان**: از میر غلام حسن، حسن دہلوی (تدوین مع پیش لفظ و تحشیہ) لاہور اکیڈمی، لاہور۔ ۱۹۶۶ء اس میں متن کے علاوہ بطور ضمیمہ درج ذیل مقالات بھی شامل ہیں: ۱۔ سحر البیان پر ایک نظر از مرتب ۲۔ سحر البیان کا مطالعہ از ڈاکٹر سید محمد عقیل ۳۔ سحر البیان از ڈاکٹر گوپی چند نارنگ ۴۔ گلزار نسیم اور سحر البیان کا تقابلی جائزہ از نقاد لکھنوی ۵۔ موازنہ سحر البیان اور گلزار نسیم از مظہر الحق دہلوی

۴۰۔ **دیوان جہاں دار** از مرزا جواں بخت جہاں دار شاہ (تدوین مع مقدمہ و تحشیہ) مجلس ترقی ادب، لاہور۔ ۱۹۶۶ء

۴۱۔ **مثنویات حسن**: (جلد اول) از میر غلام حسن، حسن دہلوی (تدوین و مقدمہ و تحشیہ) مجلس ترقی ادب، لاہور۔ ۱۸۹۶۶ء اس میں سحر البیان کے سوا میر حسن کی بقیہ تمام مثنویاں مرتب و مدون کی گئی ہیں۔

۴۲۔ **۱۹۶۵ء کے بہترین مقال** (انتخاب) مکتبہ البیان، لاہور۔ ۱۹۶۶ء اور اس میں

مرتب کے درج ذیل مقالے شامل ہیں۔ ۱۔ سحر البیان کا ایک نادر قلمی نسخہ ۲۔ یوسف زلیخا (غلام رسول عالم پوری)

۴۳ تا ۴۷۔ صحیفہ، لاہور (غالب نمبر) حصہ اول تا پنجم: (مدیر و مرتب) مجلس ترقی ادب، لاہور۔ ۱۹۶۹ء اور اپریل ۱۹۷۳ء

۴۸۔ **یونیورسٹی اورینٹل کالج کے اساتذہ کا تحقیقی، ادبی اور درسی سرمایہ**: (ترتیب و مقدمہ) یونیورسٹی اورینٹل کالج، لاہور۔ ۱۹۷۴ء

۴۹۔ **یونیورسٹی اورینٹل کالج کے ریسرچ سکالروں اور اساتذہ کی سنین وار فہرست** (ترتیب) یونیورسٹی اورینٹل کالج، لاہور۔ ۱۹۷۴ء

۵۰۔ **تاریخ ادبیات مسلمانان پاک و ہند**: جلد ششم (اردو ادب، جلد اول): (مدیر و مرتب) پنجاب یونی ورسٹی، لاہور۔ ۱۹۷۲ء

اقبالیات

۵۱۔ **منتخب مقالات اقبال ریویو**: (ترتیب) اقبال اکادمی پاکستان، لاہور۔ ۱۹۸۳ء

۵۲۔ **Selection from the Iqbal Review**: (ترتیب) اقبال اکادمی پاکستان، لاہور۔ طبع اول: ۱۹۸۳ء ایضاً۔ طبع دوم: ۱۹۹۵ء

۵۳۔ **علامہ اقبال کی تاریخ ولادت**: (ترتیب بہ اشتراک زاہد منیر عامر) بزم اقبال، لاہور۔ ۱۹۹۴ء اس میں ڈاکٹر وحید قریشی کی درج ذیل تحریریں شامل ہیں:
۱۔ علامہ اقبال کی تاریخ ولادت ۲۔ تکملہ

فارسی

۵۴۔ **نامہ عشق**: از اندر جیت منشی (تدوین) پنجابی ادب اکیڈمی، لاہور۔ ۱۹۵۹ء

۵۵۔ **دربار ملی**: منتخبہ و مرتبہ، بہ اشتراک ایس ایم اکرام۔ مجلس ترقی ادب، لاہور۔۱۹۶۱ء

۵۶۔ **ایضاً (اردو ترجمہ)**: منتخبہ و مرتبہ ایضاً مترجم عبدالحمید یزدانی۔ ایضاً ۱۹۶۶ء

۵۷۔ **ثواقب المناقب**: از محمد ماہ صداقت کنجاہی (ترتیب و حواشی) در اورینٹل کالج میگزین (چار اقساط) فروری ۱۹۸۵ء تا ۱۹۶۱ء

۵۸۔ **عمل صالح الموسوم بہ شاہجہان نامہ** (تین جلدیں): از محمد صالح کنبو۔ ترتیب و تحشیہ: دکتر غلام یزدانی۔ ترمیم و تصحیح مع مقدمہ: ڈاکٹر وحید قریشی، مجلس ترقی ادب، لاہور۔ اشاعت اول: جلد اول و دوم ۱۹۶۷ء، جلد سوم ۱۹۷۲ء، (اس سے قبل مجلس ترقی ادب، لاہور سے ۱۹۸۵ء میں اس کتاب کی پہلی اشاعت عمل میں آئی۔ ڈاکٹر وحید قریشی کی ترمیم و تصحیح سے اس کی دوسری اشاعت ہوئی اور ۱۹۷۸ء میں تیسری اشاعت)

۵۹۔ **ارمغان ایران**: (مقالات منتخبہ مجلّہ ''صحیفہ'' لاہور) (ترتیب و مقدمہ) مجلس ترقی ادب، لاہور۔۱۹۷۱ء

۶۰۔ **ھمیشہ بھار** (تذکرہ شعرائے فارسی): از کشن چند اخلاص: (تدوین، تحشیہ، مقدمہ) انجمن ترقی اردو پاکستان، کراچی۔۱۹۷۳ء

پنجابی

۶۱۔ **یارنامہ**: **(سی حرفیاں)** از عبدی قیصر شاہی (تدوین مع دیباچہ) پنجابی ادبی بورڈ، لاہور۔۱۹۶۳ء

۶۲۔ **مثنوی چندر بدن مھیار**: از قادر بخش وزیر آبادی (تدوین مع حواشی) تاج بک ڈپو، لاہور۔۱۹۹۰ء، قبل ازیں یہ متن شش ماہی ''کھوج'' شعبہ پنجابی، یونی ورسٹی اورینٹل کالج کے شمارے میں شائع ہو گیا تھا۔

تاریخ

۶۳۔ **ارمغان لاهور**: (ترتیب) پنجاب یونی ورسٹی، لاہور۔۱۹۶۷ء

ابلاغیات

۶۴۔ توضیحی کتابیات ابلاغیات (بہ اشتراک سید جمیل احمد رضوی) مغربی پاکستان اردو اکیڈمی، لاہور (۱۹۷۷ء)

درسی کتب

۶۵ تا ۶۸۔ **Pakistan Historical Readers**: (۶ حصے) بہ ترتیب و اشتراک صوفی محبوب الٰہی، صوفی عبدالعزیز، چودھری محمد حفیظ۔ فیروز، لاہور (تمام حصے) ۱۹۵۲ء

۶۹۔ اردو کی ساتویں کتاب (حصہ اول۔ دوم): ادارت بہ اشتراک سید امتیاز علی تاج، محمد کبیر رسا جالندھری، محمد اسحاق جلال پوری) محکمہ تعلیم، مغربی پاکستان، لاہور۔ طبع اول ۱۹۶۲ء

اس میں ڈاکٹر وحید قریشی کے درج ذیل مضامین شامل ہیں:

۱۔ (حصہ اول) سوات کی سیر ۲۔ (حصہ دوم) گل بدن بیگم

۷۰۔ **ادب پارے (نصاب ایف لے، اردو لازمی)** (مرتب) ثانوی تعلیمی بورڈ۔ لاہور طبع۔ ۱۹۶۲ء

ادب پارے (هائر سکینڈری امتحان کے لیے) :ترتیب و مقدمہ سنٹرل ٹیکسٹ بک کارپوریشن لمٹیڈ، لاہور۔ س۔ ن

۷۱۔ **مرقع اردو** (اردو کا لازمی نصاب برائے جماعت نہم و دہم) تالیف بہ اشتراک صوفی غلام مصطفےٰ تبسم، پروفیسر نصیر شادانی، گلوب پبلشرز، لاہور برائے پنجاب ٹیکسٹ بک بورڈ، طبع اول: مارچ ۱۹۷۳ء

۷۲۔ **پاکستان کی قدیم اردو شاعری** (برائے طلبہ ایم اے اردو): (ترتیب بہ اشتراک ڈاکٹر سید عبداللہ اور ڈاکٹر عبادت بریلوی) علمی کتاب خانہ، لاہور۔ طبع اول: ۱۹۷۶ء

۷۳۔ **مخزن ادب** (برائے طلبابی۔ اے اردو، آپشنل): (مولف حصہ نثر بہ اشتراک ڈاکٹر

غلام حسین ذوالفقار، پروفیسر مرزا ریاض) تعلیمی مرکز لاہور برائے پنجاب یونیورسٹی، لاہور

۷۴۔ **نصـــاب اردو لازمـی** (بی۔ایس۔ایجوکیشن): (نگران) علیم کتاب خانہ، لاہور۔ طبع اول: ۱۹۸۶ء

نظرثانی

پنجابی ادب

۷۵۔ *مختصر تاریخ ادب پنجابی*: از قریشی احمد حسین قلعداری۔ میری لائبریری، لاہور ۱۹۶۶ء

درسیات

۷۶۔ **انتخاب نثر اردو (بی اے کورس)**: پنجاب یونیورسٹی لاہور۔ طبع اول: ۱۹۸۱ء

۷۷۔ **دفتری اردو**: علامہ اقبال اوپن یونی ورسٹی، اسلام آباد۔ طبع اول

۷۸۔ **اصول تحقیق**۔ ایضاً طبع اول

۷۹۔ **تدوین کتب** (برائے بی۔اے) ایضاً طبع اول: ۱۹۸۸ء

۸۰،۸۱۔ **تاریخ برصغیر** (۷۱۲ء تا ۱۸۵۷ء) جلد اول (برائے انٹرمیڈیٹ): باشتراک ایضاً طبع اول ۱۹۸۸ء

مقالات

(یہ مقالات ڈاکٹر وحید قریشی کی کسی تصنیف (کتاب) میں شامل نہیں۔)

اردو ادب

۱۔ ہمارا قدیم انداز تنقید
(۱) کتاب، لاہور۔ اکتوبر ۱۹۴۶ء
(۲) شاہکار، لاہور۔ جولائی ۱۹۷۴ء

آرزو، سیالکوٹ، شمارہ، اول۔ ۱۹۴۸ء

۲۔ خالد صاحب اور علامہ شبلی — کتاب لاہور۔ فروری ۱۹۴۷ء

۳۔ شبلی اور حالی کے ہاں تنقیدی اصطلاحات — ادبی دنیا، لاہور۔ جون ۱۹۴۷ء

۴۔ قدیم غزل، قدیم شاعر — شاہ کار، لاہور۔ اکتوبر ۱۹۴۷ء

۵۔ شاد کی شاعری: ایک مطالعہ — چندن، کان پور۔ سالنامہ ۱۹۴۹ء

۶۔ انشاء کے حضور —
(۱) روزنامہ امروز، لاہور۔ جون ۱۹۴۹ء
(۲) ادبی دنیا، لاہور۔ جولائی ۱۹۴۹ء

۷۔ غزل کے بارے میں بحث — خیال، لاہور۔ اپریل ۱۹۵۳ء

۸۔ اردو شعرا کے مختصر حالات — نقوش، لاہور (غزل نمبر۔ شمارہ (۴۲،۴۱) مئی جون ۱۹۵۴ء

۹۔ چند مصنفین کی غلطیاں (سودا کے بارے میں) — روزنامہ امروز، لاہور۔ ۱۴، ۲۱، ۲۹ جون، ۷ جولائی ۱۹۵۴ء

۱۰۔ ٹریجڈی اور کامیڈی — کارواں، گجرانوالہ۔ ۱۹۵۴ء

۱۱۔ اس نظم میں (قیوم نظر کی نظم کا تجزیہ) — تسکین، گجرانوالہ۔ ۱۹۵۶ء

۱۲۔ داغ دہلوی — مشمولہ "اردو دائرہ معارف اسلامیہ" جامعہ پنجاب لاہور۔ ۱۹۶۰ء

۱۳۔ اس نظم میں (ضیاء جالندھری کی نظم کا تجزیہ) — گیت، لاہور (ادب نمبر) ۱۵ فروری ۱۹۶۱

۱۴۔ رسم الخط کا مسئلہ (قسط اول) —
(۱) نصرت، لاہور ۱۴ مئی ۱۹۶۱ء
(۲) روزنامہ آفاق، لاہور۔ جون ۱۹۶۱ء
(۳) قومی زبان، کراچی۔ جون ۱۹۶۱ء

۱۵۔ ایضاً (قسط دوم) —
(۱) محور، لاہور۔ ستمبر ۱۹۶۱ء
(۲) مشمولہ دو رسم الخط) مقالات مارچ ۱۹۸۹ء

۱۶۔ رسم الخط کا ایک نمونہ — چٹان، لاہور۔ ۱۹۶۱ء

۱۷۔ ڈاکٹر گوپی چند نارنگ کی تحقیقی کتب۔ جائزہ — اورینٹل کالج میگزین، لاہور۔ مئی ۱۹۶۳

۱۸۔ اردو بحیثیت قومی زبان —
(۱) مشمولہ ذکر اردو (اردو کانفرنس) تعلیم الاسلام کالج، ربوہ نومبر ۱۹۶۴ء
(۲) قومی زبان، کراچی۔ ۱۹۶۴ء
(۳) شہاب، لاہور۔ ۱۹۶۵ء

(۴) نیرنگ خیال (اردو کانفرنس نمبر) ۱۹۶۵ء

۱۹۔ حیات اقبال کے چند فراموش شدہ اوراق چٹان، لاہور (اقبال نمبر) ۱۹۶۵ء

۲۰۔ فرہنگ شیرانی (نگرانی و ترمیم) (قسط اول) فنون، لاہور۔ اکتوبر ۱۹۶۵ء

۲۱۔ ایضاً (قسط دوم) ایضاً۔ فروری ۱۹۶۶ء

۲۲۔ تقریر غالب نقوش، لاہور (غالب نمبر) اکتوبر دسمبر ۱۹۶۶ء

۲۳۔ چین کی حقیقتیں اور افسانے اردو، ڈائجسٹ، لاہور
اگست، اکتوبر، نومبر، دسمبر ۱۹۶۶ء

۲۴۔ ولی۔ ایک مباحثہ اوراق، لاہور۔ ۱۹۶۷ء

۲۵۔ کچھ نفسیاتی تحریک کے متعلق ہمایوں، دہلی۔ فروری ۱۹۶۸ء

۲۶۔ اردو میں مزاح نگاری اوراق، لاہور۔ اپریل ۱۹۶۹ء

۲۷۔ ترقی پسند تحریک اپنے آئینے میں ہفتہ وار زندگی، لاہور۔ (۱۲۲ قساط)
۱۵ دسمبر ۱۹۶۹ء تا ۲۵ مئی ۱۹۷۰ء

۲۸۔ گورنمنٹ کالج کی چند یادیں پطرس، لاہور۔ ۱۹۷۰ء

۲۹۔ جعفری صاحب مشمولہ 'سید رئیس احمد جعفری فن اور شخصیت'
رئیس احمد جعفری اکیڈمی، کراچی، اکتوبر ۱۹۷۰ء

۳۰۔ اردو زبان و ادب کا ارتقاء مشمولہ 'تجدیدی فروری رمارچ ۱۹۷۱ء
کورس برائے اساتذہ اردو

۳۱۔ انشائیہ (مذاکرہ) اوراق، لاہور۔ مارچ اپریل ۱۹۷۲ء

۳۲۔ ہمارے ادبی مسائل (مذاکراہ) نقوش، لاہور۔ شمارہ ۱۱۸۔ سالنامہ) فروری مارچ ۱۹۷۲ء

۳۳۔ پرواز عقاب (عبدالعزیز خالد) تجزیہ (۱) نیرنگ خیال، لاہور، سالنامہ، ۱۹۷۳ء
(۲) تحریریں (عبدالعزیز خالد نمبر) لاہور۔ ۱۹۷۵ء

۳۴۔ اکبر الہ آبادی کی شاعری المعارف، لاہور۔ نومبر ۱۹۷۴ء

۳۵۔ داستان صحافت
(ڈاکٹر عبدالسلام خورشید) تجزیہ اداکار، لاہور۔ دسمبر ۱۹۷۴ء

۳۶۔ ایک قابل اعتماد دوست
(خواجہ صلاح الدین) ٹیکنیکو لاہور۔ ۱۹۷۴ء

۳۷۔ چغتائی کا فن 'مرقع غالب' کی روشنی میں اوراق، لاہور۔ ۱۹۷۵ء

۳۸۔ خط بہار کے چند اوراق — تعلیمات، لاہور۔ مارچ ۱۹۷۸ء

۳۹۔ خط بہار — مجلہ تحقیق، جامعہ پنجاب، لاہور۔ (شمارہ اول) ۱۹۷۹ء

۴۰۔ ادیب، ادب اور معاشرہ — مشمولہ 'روداد قلم قبیلہ' کوئٹہ ۱۹۷۹ء

۴۱۔ اردو ادب اور عید الفطر — ماہ نو، لاہور۔ اگست ۱۹۸۱ء

۴۲۔ اردو ادب 'مشمولہ پاکستانی ادب' مرتبہ عبدالشکور احسن۔ — ادارہ تحقیقات پاکستان، لاہور طبع اول اگست ۱۹۸۱ء، طبع دوم اگست ۱۹۹۲ء

۴۳۔ آئینہ ایام (کرنل غلام سرور) — نیرنگ خیال تجزیہ، راولپنڈی (سالنامہ) جون ۱۹۸۲ء

۴۴۔ ادب میں دو قومی نظریے کی تلاش — ماہ نو، لاہور۔ اگست ۱۹۸۲ء

۴۵۔ ہمارے ادب کے آفاقی رشتے (۱) فانوس، لاہور (خصوصی شمارہ) اکتوبر ۱۹۸۲ء
مشمولہ 'مقالات کل پاکستان اہل قلم کانفرنس'
اکادمی ادبیات پاکستان، اسلام آباد۔ ۱۹۸۱ء

۴۶۔ دیگر احوال یہ ہے کہ (مختار زمن) تجزیاتی مطالعہ — افکار، کراچی۔ اگست ۱۹۸۳ء

۴۷۔ آب رود گنگا (رفیق ڈوگر) تجزیہ — معاصرہ، لاہور۔ ستمبر ۱۹۸۳ء

۴۸۔ بسمل جذبوں اور کومل آواز کا شاعر (حالی) — اسلوب، کراچی (تخلیقی ادب جلد ۳) اکتوبر، نومبر ۱۹۸۳ء

۴۹۔ مصنف، تصنیف اور تحریر رائٹرز ورکشاپ — (۲ تا ۷ مئی ۱۹۸۱ء) نیشنل بک کونسل، اسلام آباد، ۱۹۸۳ء

۵۰۔ اردو ادب کی مختصر ترین تاریخ — الفاظ، کراچی (سلیم اختر نمبر) جنوری ۱۹۸۵ء

۵۱۔ ماضی قریب اور لمحہ رواں کی غزل (مذاکرہ) نقوش، لاہور (شمارہ ۱۳۲) جون ۱۹۸۵ء

۵۲۔ عصری تنقید (مذاکرہ) — ایضاً۔ ایضاً

۵۳۔ فشار (امجد اسلام امجد) ایک تجزیہ — ماہ نو، لاہور۔ جولائی ۱۹۸۶ء

۵۴۔ وزیر آغا کے عناصر ثلاثہ — مشمولہ 'شام کا سورج'، لاہور۔ ۱۹۸۹ء

۵۵۔ محمد حسین آزاد: ماہر لسانیات — کاوش گورنمنٹ کالج، لاہور۔ ۱۹۹۱ء

۵۶۔ راسخ کا ہاتھ اور عہد کی نبض — محفل، لاہور (راسخ عرفانی نمبر) اپریل ۱۹۹۱ء

۵۷۔ پاکستان میں کتب خانوں کا کردار — (۱) پلسا نیوز، لاہور۔ جولائی ۱۹۹۱ء
(۲) اردو نامہ، لاہور۔ اپریل ۱۹۹۲ء

۵۸۔ اردو ہماری قومی زبان — نوائے وقت، ملتان۔ اپریل ۱۹۹۲ء

۵۹۔ قومی زبان اور ہمارا تشخص — طوفان، ملتان اپریل ۱۹۹۲ء

٦٠۔ خوفزدہ غالب اور عصری صورت حال	(۱) اوراق، لاہور۔ جون جولائی ۱۹۹۲ء (۲) غالب نامہ، دہلی (بھارت) اگست ۱۹۹۲ء (۳) مشمولہ 'اردو رسائل ۱۹۹۲ء میں خدا بخش اورینٹل پبلک لائبریری، پٹنہ۔ ۱۹۹۳ء
٦١۔ افسانوی ادب کا انوکھا تجزیہ	آواز جرس، لاہور۔ جنوری ۱۹۹۳ء
٦٢۔ نئی نسل اور پاکستانی ادیب کا کردار	پکار، منصورہ، لاہور (ادبیات نمبر) جولائی اگست ۱۹۹۳ء
٦٣۔ جاگیر غالب: ایک مطالعہ	(۱) تحقیق نامہ گورنمنٹ کالج، لاہور۔ شمارہ ۹۴ء (۲) طلوع افکار، کراچی۔ ۱۹۹۵ء (۳) ارتکاز، کراچی۔ مئی ۱۹۹۵ء (۴) مشمولہ 'نقوش غالب' الوقار لاہور ۱۹۹۵ء
٦٤۔ حقی کا ایک شاہ کار منظوم ترجمہ ان کے کردار کی روشنی میں	تحریریں، لاہور۔ جنوری ۱۹۹۵ء
٦٥۔ قومی زبان۔ عصری تقاضے، مشمولہ سیمی نار ۱۹۹۵ء	مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد۔ ۲۳ مئی ۱۹۹۵ء

اقبالیات

۱۔ ایک اقبالی نقاد	یادگار، لاہور۔ ۱۹۵۴ء
۲۔ اقبال کے تیرہ غیر مطبوعہ خطوط	روزنامہ آفاق، لاہور ۱۹۵۵ء
۳۔ اقبال کا رنگ اصلاح	کردار نو، لاہور۔ اپریل مئی ۱۹۵۹ء
۴۔ حیات اقبال کے چند فراموش شدہ اوراق	چٹان، لاہور۔ (اقبال نمبر) ۱۹۶۵ء
۵۔ ولادت اقبال کے سلسلے کی ایک تائیدی دلیل	(۱) راوی، گورنمنٹ کالج، لاہور۔ (صد سالہ نمبر) اپریل ۱۹۷۷ء (۲) صریر خامہ، حیدر آباد (اقبال نمبر) ۱۹۷۷ء
۶۔ آثار اقبال	صحیفہ، لاہور۔ (اقبال نمبر، حصہ اول) اکتوبر ۱۹۷۳ء
۷۔ اقبال اور عشق رسول	(۱) اقبال، لاہور۔ (اقبال نمبر) ۱۹۷۷ء کتابچہ بعنوان: اقبال شاعر اور فلسفی ۱۹۷۰ء

۸۔خطوط اقبال کا ذخیرہ محمد عمر الدین سویرا، لاہور، جنوری، مارچ ۱۹۷۸ء

۹۔اقبال اور ہمارے علاقائی اختلافات (۱) دائرے، کراچی۔ جولائی ۱۹۸۷ء
(۲) صحیفہ، لاہور۔ اکتوبر، دسمبر ۱۹۸۸ء
(۳) ادب دوست۔ لاہور۔ نومبر ۱۹۹۲ء

۱۰۔افکار اقبال صحیفہ، لاہور۔ اکتوبر۔ دسمبر ۱۹۸۸ء

۱۱۔اقبال اور پاکستان کا تخیل ایضاً ایضاً

۱۲۔اقبال اور ملی تشخص ایضاً ایضاً

۱۳۔اقبال اور مرد مومن ایضاً ایضاً ایضاً

۱۴۔اقبال ایک سیاسی مفکر ادب دوست، لاہور۔ اپریل ۱۹۹۶ء

فارسی

۱۔ایران میں ڈراما نگاری روزنامہ زمیندار، لاہور، شاہ ایران نمبر، ۱۹۴۹ء

۲۔منابع قدیم برائے احوال سعدی کاروان، گجرانوالہ۔ ۱۹۵۶ء

۳۔مثنوی معنوی، از مولانا روم، ترجمہ و حواشی مرکز تحقیقات فارسی ایران و پاکستان.
از قاضی سجاد حسین جلد اول پیش گفتار، فارسی اسلام آباد۔ ۱۹۷۸ء

۴۔احوال و آثار عبدی قیصر شاہی (مترجم دیوان حافظ)
مجلہ دانش، اسلام آباد شمارہ نمبر ۱۵، ۱۹۸۸ء

۵۔شعر اقبال (فارسی) اقبالیات (فارسی) لاہور۔ جلد ۴ شمارہ نمبر ۱۔ ۸۹ء

۶۔تصور وطنیت در اقبال لاہوری ایضاً۔ ۱۹۹۳ء

۷۔مسائل تدریس فارسی در پاکستان ایضاً۔ جلد ۱۰ شمارہ نمبر ۱۔ ۱۹۹۴ء

۸۔جایگاہ زبان فارسی در اقبال شناسی مشمولہ علامہ اقبال اور فارسی زباں، خانہ
فرہنگ ایراں، لاہور۔ ۱۹۹۵

پنجابی

۱۔نادر دی وار دا اک نسخہ پنجابی ادب، لاہور۔ فروری ۱۹۶۱ء

Hasnain Sialvi

۲۔ سسی پنوں — ایضاً۔ نومبر ۱۹۶۱ء
۳۔ پنجابی املا تے معیاری لکھت — ایضاً۔ اپریل ۱۹۶۲ء
۴۔ مولوی غلام رسول عالم پوری
تے اوہناں دی یوسف زلیخا۔ — ایضاً، اگست ۱۹۶۳ء
۵۔ یوسف زلیخا — ماہ نو، کراچی۔ اپریل ۱۹۶۵ء
۶۔ مقدمہ: غزلیات حافظ شیرازی،
مترجم مولانا محمد عبداللہ عبدی۔ مرتبہ: محمد باقر — پنجابی ادبی اکیڈمی، لاہور ۱۹۶۶ء
۷۔ پنجابی زبان دے نویں تقاضے:
معیاری قواعد — لہراں، لاہور۔ جنوری ۱۹۶۷ء
۸۔ اقبال تے پاکستان — ایضاً اپریل ۱۹۶۷ء
۹۔ پنجابی زبان وادب کا جائزہ مشمولہ: ''نذر ملک'' مطبوعہ نئی دہلی۔ ۱۹۷۰ء
۱۰۔ فقیر دیاں جنگی نظماں — (۱) مہر وماہ، لاہور۔ (فقیر نمبر) ۱۹۷۵ء
(۲) ادبی مہکاں، لاہور۔ ۱۹۸۰ء
(۳) مشمولہ 'ستاراں دن' از فقیر محمد فقیر
اورینٹ پبلشرز، لاہور۔ ۱۹۹۰ء
۱۱۔ پنجابی زبان تے ادب دا جائزہ (۱۲ اقساط) — وارث شاہ، ملتان، اکتوبر، نومبر ۷۷ء
۱۲۔ پنجابی غزل دی روایت تے فقیر محمد فقیر — مہر وماہ، لاہور۔ (فقیر نمبر) ۱۹۷۶ء
۱۳۔ اقبال دا فلسفہ عشق — وارث شاہ، ملتا، نومبر دسمبر ۱۹۷۷ء
۱۴۔ اکبر کاظمی دی پنجابی غزل — پربت، لاہور۔ نومبر ۱۹۷۸ء

تاریخ

۱۔ تاریخ لاہور پر ایک نظر — تاریخ وسیاسیات، کراچی۔ نومبر ۱۹۵۶ء
۲۔ تاریخ اسلام: ایک جائزہ — ترجمان القرآن، لاہور۔ جلد: ۴۹، ۱۹۵۶ء
۳۔ رنجیت سنگھ کے عہد کی ایک دستاویز — علم، لاہور۔ اپریل مئی ۱۹۶۲ء
۴۔ علی مردان کا ذوق تعمیرات — برقاب، لاہور ستمبر ۱۹۶۳ء
۵۔ کرنافلی کا کثیر المقاصد منصوبہ (ترجمہ) — ایضاً اکتوبر ۱۹۶۳ء

۶۔ گوجرانوالہ تاریخ کے آئینے میں — قومی دلیر گوجرانوالہ۔ ۱۹۷۱ء

۷۔ شیخ دین محمد مرحوم — مارچ ۱۹۷۵ء

۸۔ مسلم لیگ کا دورِ حکومت (از ڈاکٹر صفدر محمود) تجزیہ — اوراق لاہور ۱۹۷۷ء

۹۔ تحریک پاکستان کے ثقافتی عوامل — دستاویز، راولپنڈی۔ ۱۹۷۸ء

۱۰۔ ایضاً (انگریزی ترجمہ) — فرنٹیر پوسٹ۔ ۱۹۸۷ء

۱۱۔ تحریک پاکستان کا پس منظر — قومی ڈائجسٹ، لاہور۔ اگست ۱۹۹۲ء

۱۲۔ قیام پاکستان کی کہانی — ہفتہ وار زندگی، لاہور۔ اگست ۱۹۹۲ء

۱۳۔ ڈاکٹر وحید قریشی کی یادداشتیں — (قلم بندی: خالد ہمایوں) ایضاً۔ ۱۵ اگست ۹۲ء

۱۴۔ اکیسویں صدی کی تیاری: مشکلات — (۱) اردو نامہ، لاہور۔ جولائی ۱۹۹۳ء
(۲) پاکستانی ادب، اسلام آباد۔ ۱۹۹۳ء

۱۵۔ قائداعظم کیا چاہتے تھے؟ — اردو نامہ، لاہور۔ جولائی ۱۹۹۳ء

تعلیم

۱۔ Educational Reforms in West Pakistan کاروان، گوجرانوالہ۔ ۱۹۶۵ء

۲۔ مشرقی زبانیں اور نیا نظام تعلیم

۳۔ یکساں نظام تعلیم (خطبہ صدارت) مشمولہ ’مجلّہ تعلیم، نمبر ۴ انسٹی ٹیوٹ آف پالیسی اسٹڈیز
اسلام آباد۔ ۱۹۸۶ء

۴۔ تعلیم اسلامی تناظر میں — ایضاً — ایضاً

۵۔ ذریعہ تعلیم حالیہ فیصلے کے مضمرات۔ (خطبہ صدارت)
مشمولہ: پاکستان میں ذریعہ تعلیم۔ مجلّہ تعلیم نمبر ۹، ایضاً ۱۹۹۰ء

۶۔ نظام امتحانات اور معیار تعلیم
مشمولہ: پاکستان میں نظام امتحانات۔ بحران، اسباب، حال، ایضاً ۹۹

۷۔ پاکستان میں ذریعہ تعلیم کا مسئلہ — مشمولہ: مجلّہ تعلیم نمبر ۱۱، ایضاً ۱۹۹۱ء
(۲) تفکر، لاہور۔ ۱۹۹۴ء
(۳) اردو نامہ، لاہور۔ جنوری ۱۹۹۵ء

۸۔ دس سالہ تعلیمی پالیسی کا تنقیدی جائزہ — مشمولہ: قومی تعلیمی پالیسی (۹۲۔۲۰۰۲ء)

۹۔قومی تعلیمی پالیسی اردو نامہ، لاہور۔ اکتوبر ۱۹۹۳ء

۱۰۔طباعت انڈسٹری کا مستقبل (خطبہ صدارت)

مشمولہ: ورکشاپ رپورٹ۔ نیشنل بک کونسل لاہور۔ ۱۹۸۸ء

دیباچے / تعارف / مقدمے / تبصرے

اردو ادب

۱۔احوال غالب، مرتبہ، مختار الدین احمد آرزو (تبصرہ) دستور، لاہور۔ ۱۹۵۵ء

۲۔دیوان شیفتہ، از نواب محمد مصطفٰے خاں شیفتہ ایضاً (۱) ایضاً ۱۹۵۵ء

(۲) نئی تحریریں، لاہور۔ ۱۹۶۰ء

۳۔خلش خار از راغ عرفانی (تعارف) مکتبہ نور، گجرانوالہ۔ ۱۱ ستمبر ۱۹۵۵ء

۴۔انتخاب کلام، مرتبہ: شاکر سہارنپوری (مقدمہ) بزم اقبال گجرانوالہ۔ اگست ۱۹۵۶ء

۵۔کیف دوام، از ملک منظور (تعارف) ناشر و سنہ ندارد۔ ۲۹ اپریل ۱۹۶۳ء

۶۔انتخاب دیوان حالی، مرتبہ حفیظ جالندھری (تبصرہ) صحیفہ، لاہور۔ شمارہ ۲۳ اپریل ۱۹۶۳ء

۷۔صلیب درد از سہیل اختر (دیباچہ) پیرامائٹ نیوز کارنر (ڈیری غازی خان) ۱۹۶۳ء

۸۔روزگار فقیر از فقیر سید وحید الدین (تبصرہ) فنون، لاہور

۹۔انسان زندہ ہے از نزہت اکرام (مقدمہ) لاہور۔ ۱۹۷۵ء

۱۰۔نگاہ اور نقطے از سلیم اختر (مقدمہ) جدید ناشرین لاہور۔ ۱۹۶۸ء

۱۱۔تیکھے تیور (بجنگ آمد از کرنل محمد خان) (تبصرہ) نیرنگ خیال، راولپنڈی۔ ستمبر ۶۸ء

۱۲۔نقوش جاوداں از محمد یعقوب حاکم (دیباچہ) راوی بک ہاؤس لاہور۔ ۱۹۷۱ء

۱۳۔سنگ بیتی از ارشد میر (مقدمہ) میری لائبریری، لاہور۔ ۱۹۷۱ء

۱۴۔نیرنگ خیال از مولانا محمد حسین آزاد،

مرتبہ ڈاکٹر غلام حسین ذوالفقار (تبصرہ) اوراق، لاہور۔ ۱۹۷۳ء

۱۵۔ایک جنگ ایک المیہ از آغا اشرف اوراق لاہور۔ ۱۹۷۳ء

۱۶۔پاکستان مسلم لیگ کا دورہ حکومت از صفدر محمود (تبصرہ) ایضاً

۱۷۔صحافتی زبان از مسکین علی حجازی (مقدمہ) سنگ میل پبلی کیشنز لاہور۔ جون ۷۵ء

۱۸۔علمی اردو لغت مولفہ وارث سرہندی (تبصرہ) کتابچہ مطبوعہ لاہور۔۱۹۷۷ء

۱۹۔حرف گریزاں از راسخ عرفانی (مقدمہ) مکتبہ نور ادب گجرانوالہ۔۱۹۷۸ء

۲۰۔نوائے مشرق از علی اختر (مقدمہ) مکتبہ کارواں لاہور۔۱۹۷۸ء

۲۱۔ورق ورق از شاہد شیدائی (تبصرہ) مکتبہ تاجور لاہور (کتابچہ) ۲۹ دسمبر ۷۵ء

۲۲۔سندھی مسلم از جی الانا (تعارف) سندھی ادبی بورڈ، حیدر آباد مئی ۸۴ء

۲۳۔توقیر ادب (دیوان ذوقی) (پیش لفظ) انجمن ترقی ادب پاکستان، لاہور۔ جولائی ۱۹۸۶ء

۲۴۔زبان اور ثقافت از ڈاکٹر غلام علی الانا (پیش لفظ) علامہ اقبال اوپن یونی ورسٹی، اسلام آباد۔ جولائی ۱۹۸۷ء

۲۵۔مہمان خصوصی کا خطاب (متعلق بہ انشائیہ) مشمولہ انتخاب، (انشائیہ نمبر) اسلامیہ یونیورسٹی بہاول پور۔۸۸

۲۶۔شب گل از اشرف قدسی (پیش لفظ) مکتبہ فردا، لاہور۔ اپریل ۱۹۹۱ء

۲۷۔انور سدید کے موضوعات از ڈاکٹر انور سدید مشمولہ "موضوعات" مکتبہ عالیہ لاہور۔۱۹۹۱ء

۲۸۔ہمارے عہد کا استاد شاعر (دیباچہ) مشمولہ 'تورات دل' از یزدانی جالندھری سید پبلشرز لاہور۔۱۹۹۱ء

۲۹۔رحمت یزداں۔ از طفیل ہوشیاری پوری (مقدمہ) (۱) احسان اکیڈمی، لاہور بار اول ۹۲ء

(۲) محفل، لاہور (طفیل نمبر) مئی ۹۳ء

۳۰۔شہر بے ساعت از عارف عبدالمتین (پیش لفظ) (۱) لاہور

(۲) مفیض گجرانوالہ (عبدالمتین نمبر) دسمبر ۱۹۹۳ء

۳۱۔تہذیب کے زخم از ثاقبہ رحیم الدین (تاثرات) مطبوعہ راولپنڈی، ۱۹۹۴ء

۳۲۔شاخ نمو۔ از نصیر الدین (پیش لفظ) ماوراء پبلشرز، لاہور۔۱۹۹۴ء

۳۳۔حاضری از فوزیہ سلیمی (دیباچہ) فیروز سنز، لاہور۔۱۹۹۵ء

۳۴۔جہاں دریا اترتا ہے از اختر حسین جعفری (تبصرہ) فردا پبلشنگ ہاؤس لاہور، ۱۹۹۳ء

دانشور، لاہور۔ اپریل جون ۱۹۹۶ء

۳۵۔اعتبارات (تبصرہ) تحقیق نامہ، گورنمنٹ کالج، لاہور۔۹۶۔۱۹۹۵ء

۳۶۔انجمن پنجاب کے مشاعرے۔ مرتبہ (تبصرہ) تحقیق نامہ، گورنمنٹ کالج، لاہور۔۹۶۔۱۹۹۵ء

اقبالیات

۱۔میزان اقبال از مرزا محمد منور یونیورسٹی بک ایجنسی، لاہور۔ (تبصرہ)

اوراق، لاہور۔۱۹۷۳ء

۲۔تشبیہات اقبال از نذیر احمد (تعارف) بزم اقبال، لاہور۔۱۹۷۷ء

۳۔کنایات اقبال مرتبہ رفیع الدین ہاشمی (مقدمہ) اقبال اکادمی پاکستان، لاہور۔۷۷ء

فارسی

Sad Maidan (انگریزی ترجمہ) (مقدمہ) ۱۹۸۲ء

پنجابی

۱۔سراپائے حبیب از قریشی احمد حسین
قلعداری (مقدمہ) گجرات۱۹۶۲ء

۲۔تل پھل از کنہیالال کپور (مقدمہ) مکتبہ میری لائبریری، لاہور۔۱۹۶۵ء

۳۔سوسیانے، اکومت مرتبہ: شہباز ملک (پیش لفظ) پنجابی ادبی بورڈ، لاہور۔۱۹۶۸ء

۴۔پھلاں بھری چنگیر از منصور خالد (مقدمہ) الکلام، گجرانوالہ۔۱۹۶۹ء

۵۔ادبی رشماں از حافظ عبدالحمید سرشاد (مقدمہ) سرشار کالج، لاہور۔جنوری ۱۹۷۰ء

۶۔دلدیاں پیڑاں از اختر حسین (دیباچہ) مکتبہ لہراں، لاہور۱۹۷۱ء

۷۔کھلرے موتی از اختر حسین اختر (مقدمہ) مکتبہ لہراں، لاہور (ایضاً)

۸۔تصوف تے پنجابی دے صوفی شاعر
از سرفراز قاضی (مقدمہ) کتاب خانہ، دانشوراں، لاہور۱۹۷۳ء

۹۔ارمغان حجاز (فارسی حصے دا پنجابی ترجمہ
ترجمہ عبدالغفور اظہر (مقدمہ) سنگ میل پبلی کیشنز لاہور۱۹۷۳ء

۱۰۔ادبی چھلاں از عبدالحمید سرشار (مقدمہ) کتاب خانہ دانشوراں، لاہور۔۱۹۷۴ء

۱۱۔کانگاں از مسعود عالم رانا (مقدمہ) ظفر اقبال بک ایجنسی، لاہور۔جنوری۱۹۷۴ء

۱۲۔اسرار خودی (پنجابی ترجمہ) ترجمہ سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور۔۱۹۷۵ء

۱۳۔مثنوی مسافر (پنجابی ترجمہ)
ترجمہ احمد حسین قریشی قلعداری مکتبہ میری لائبریری، لاہور،۱۹۷۶ء

۱۴۔خیال، خواب تے رنگ
از شاہین نازلی (مقدمہ) کتاب منزل، لاہور۔۱۹۷۸ء
۱۵۔سر گی داتار از سلیم کاشر آئینہ ادب، لاہور۔۱۹۷۸ء
۱۶۔پنجابی لسانیات۔از شہباز ملک (دیباچہ) مکتبہ میری لائبریری، لاہور۔۱۹۷۷ء
۱۷۔اقبال دیاں لمیاں نظماں
از خلیل آتش (مقدمہ) بزم اقبال، لاہور۔۱۹۷۷ء
۱۸۔ویروے از سید اختر حسین جعفری (دیباچہ) مصنف خود ناشر، لاہور۔۱۹۷۹ء
۱۹۔ہوادی سولی از سلیم کاشر (مقدمہ) آئینہ ادب، لاہور۔۱۹۸۲ء
۲۰۔پنجابی ادب نے ڈاکٹر شہباز ملک۔
مرتبہ نبیلہ رحمٰن (دیباچہ) پاک پنجابی کونسل، لاہور۔۱۹۹۲ء

تاریخ

۱۔کشمیر کے فنون لطیفہ اور تاریخی شواہد
از ہدایت اللہ اختر (پیش لفظ) ڈاکٹر عبدالکریم گریجویٹ ریسرچ لائبریری، سیالکوٹ۔۱۹۷۱ء
۲۔A Political Study of Pakistan از صفدر محمود (تبصرہ) لاہور۔۱۹۷۲ء
۳۔تحریک پاکستان میں خواتین کا حصہ از سرفراز مرزا (تبصرہ) صحیفہ، لاہور، اپریل ۱۹۷۲ء
۴۔ایوان صدر میں سولہ سال، م۔ب خالد (مقدمہ) دید شنید پبلی کیشنز، لاہور۔۱۹۸۸ء
۵۔سیاحت نامہ کشمیر و پنجاب از بیرن ہیوگل (مقدمہ) مترجم: محمد حسن صدیقی (مقدمہ) مجلس ترقی ادب لاہور، ۱۹۹۰ء
۶۔آل انڈیا مسلم لیگ اور اردو۔محمد حنیف شاہد مترجم اعجاز احمد فاروقی (مقدمہ) ریسرچ انسٹی ٹیوٹ ، ریاض (سعودی عرب) اشاعت دوم۔مارچ ۱۹۹۲ء
۷۔تحریک پاکستان اور اسلامیہ کالج ریسرچ سوسائٹی آف پاکستان، لاہور۔از احمد سعید (مقدمہ) جون ۱۹۹۲ء
۸۔دیوار برلن اور دیوار برہمن از پروفیسر محمد منور (تعارف) مکتبہ وحدت ملی، لاہور جولائی ۱۹۹۲ء
۹۔قائداعظم اور کشمیر از غلام حسین اظہر (تبصرہ) لاہور۔جولائی ۱۹۹۲ء

ڈاکٹر وحید قریشی کی اہم تحریریں

مَیں اور حالیؔ

اے خداوند! میری دُعا سُن ۔ میری التجا پر کان لگا۔
اپنی وفاداری اور صداقت میں مجھے جواب دے اور اپنے
بندہ کو عدالت میں نہ بلا کیونکہ تیری نظر میں کوئی آدمی راست
باز نہیں ٹھہر سکتا۔

(کتابِ مقدس)

زندگی میں بعض ایسے لمحے بھی آتے ہیں جب انسان اعتراف میں لذت محسوس کرتا ہے میں اور حالی، کا عنوان بھی ذاتی محاسبے کی ایسی ہی شکل ہے۔ ماضی کے ورق الٹنے سے ضلع منٹگمری کی ایک دور افتادہ بستی کسوال دکھائی دیتی ہے۔ ۱۹۳۰ء کا زمانہ تھا۔ والد صاحب ملازمت کے سلسلے میں وہاں متعین تھے۔ ایسے پس ماندہ علاقے میں تھانیدار کی حیثیت ایک نواب سے کم نہیں ہوتی۔ زندگی کی سبھی سہولتیں میسر تھیں، کھیلنے کے لئے ہم عصر بچّوں کا حلقہ تھا میں دُوسری جماعت میں پڑھتا تھا۔ میں تھا اور مجھ سے دو ایک سال بڑی بہن تھی۔ ماں باپ کی توجہ کا مرکز میں زیادہ تھا۔ لاڈ پیار میں پلنے والا خود سر اور حکومت کے نشے میں سرشار ہوتا ہی ہے۔ ایسے ماحول میں سنورنے سے زیادہ بگڑنے کے لچھن ہوتے ہیں میری طبیعت دوسروں کی دھونس برداشت نہیں کر سکتی۔ والدین نے اس بات کا احساس کیا اور کبھی اپنی نگرانی کو میرے لئے نا قابلِ برداشت نہیں ہونے دیا۔ اس طرح ماحول بڑی حد تک سازگار ہو گیا۔

چک نمبر ۴ میں تعلیم کے لئے روز جانا پڑتا تھا۔ اپنے ہم جماعتوں سے گھلنے ملنے کا موقع بھی ملتا تھا لیکن کبھی کبھی یہ ہم جماعت میرے ہاتھوں پٹ بھی جاتے تھے۔ تعلیم میں مَیں ان سے آگے تھا۔ گھر پر بھائی خورشید اتالیق تھے۔ باتوں باتوں میں پڑھانے کا ڈھنگ انہیں خوب آتا تھا۔ شعر پڑھنے کا شوق بھی رکھتے تھے اور اگرچہ خود نہیں کہتے تھے (اور یہ توفیق انہیں آج تک نصیب نہیں ہو سکی کہ ایک مصرع

بھی کہہ سکیں)۔انہیں اردو فارسی کے شعراء کے خاصے شعر یاد تھے۔اردو فارسی کے بعض آسان شعر وہ مجھے بھی یاد کروایا کرتے تھے۔ چنانچہ اقبال کی ''پرندے کی فریاد'' اور حالی کی وہ ''نعت: وہ نبیوں میں رحمت لقب پانے والا'' مجھے اس زمانے میں ازبر کرائی گئیں۔اس کے علاوہ فردوسی کے دو چار شعر بھی میرے نوک زباں ہوتے۔ حالی سے میرا یہ ابتدائی تعارف تھا۔ورنہ نہ میں حالی سے ملا ہوں اور نہ انہیں دیکھا ہے نہ دیکھنے کی ہوس ہے۔وہ یہاں نہیں آسکتے میں وہاں جانے سے گھبراتا ہوں۔ایک لحاظ سے یہ بہت اچھا ہی ثابت ہوا۔اگر انہیں دیکھنے یا ان سے ملنے کا موقع پیدا ہوتا۔تو ان کے مدّاحوں کی طرح میں بھی ان کی شاعری اور شخصیت کو غلط ملط کر دیتا۔

جب تیسری جماعت میں پہنچا تو والد صاحب تبدیل ہو کر حویلی (ضلع منٹگمری) میں آگئے۔وہاں کے ڈسٹرکٹ بورڈ اسکول میں تعلیم ہونے لگی۔ بھائی خورشید کا تبادلہ کرا کے انہیں بھی یہیں لایا گیا۔اسی زمانے میں حالی کی مسدّس سے واقف ہوا۔اس کے بعض بند مجھے اُسی زمانے میں یاد ہوگئے اس کے بعد مسدّس پڑھنے کا کئی بار موقع ملا ہے لیکن وہ لذت جو اس زمانے میں اس سے آئی تھی۔اس کی یاد تازہ ہے اگرچہ کلام حالی سے دوبارہ اتنا لطف مجھے کبھی حاصل نہیں ہو سکا۔

حالی کی ذات میرے لئے کچھ عرصے کے لیے ہی جاذب رہ سکی، پھر اس کی حیثیت ثانوی ہوگئی۔گھر پر والد صاحب عالمگیر، نیرنگ خیال اور کارواں، وغیرہ منگوانے تھے۔خاص میرے لیے ہونہار کا پرچہ آتا تھا اور تاجور کے رسالے بھی اسکول سے مل جاتے تھے۔ اقبال کی بانگ درا اور بال جبریل کو بھی اسی زمانے میں دیکھا لیکن توجہ زیادہ تر افسانوں کی طرف تھی۔ حالی فراموش ہوگئے اسی دور میں ادب کی بجائے میرا شوق مجھے فنون لطیفہ کی طرف لے گیا گوجرانوالے کا قیام (۱۹۳۶ء، ۱۹۳۸ء) زیادہ تر ڈرائنگ کے شوق میں بسر ہو گیا پھر لاہور آیا تو اگرچہ میٹرک میں اردو بھی مضمون تھا لیکن اُردو سے مجھے رسائل کی ورق گردانی کے سوا سروکار نہ تھا۔شاعری میں چنداں لطف نہ ملتا تھا۔اس کے گوناگوں اسباب تھے (جن کی تفصیل کا یہ موقع نہیں)۔

میں شروع ہی سے والدین کی توجہ کا مرکز رہا ہوں اور ۱۹۴۰ء سے جب بہن فوت ہوئی گھر والوں کی توجہ میری طرف پہلے سے بھی زیادہ ہوگئی میں متوسط گھرانے کا تھا لیکن مجھے اعلیٰ سے اعلیٰ تعلیم دلانے میں کبھی کوتاہی نہیں کی گئی۔میری خواہشات اور میری مرضی کا ہمیشہ خیال رکھا گیا لیکن زندگی میں یہی باتیں تو سب کچھ نہیں۔ایک فرد کی حیثیت سے میں کبھی گردوپیش سے غافل نہیں تھا۔میری توجہ گھر سے زیادہ کالج کی طرف ہوگئی۔ علاوہ ازیں اپنی ذاتی لائبریری بنانے کا خیال بھی اسی زمانے میں ہوا۔۱۹۴۲ء میں جب کالج (گورنمنٹ کالج، لاہور) میں میرا دوسرا سال تھا۔جدید اردو شاعری اور فارسی شاعری کی کتابیں جمع کرنے لگا۔اس دوران میں اختر شیرانی، حفیظ جالندھری اور احسان دانش کے تتبع میں شعر بھی

کہے۔ یہی دَور میرے لیے حالی سے تیسری بار متاثر ہونے کا ہے۔ اگرچہ یہ دَور (خصوصاً ۱۹۴۰ء۔۱۹۴۲ء) فارسی زبان وادب سے استفادے کا دور ہے تاہم کالج میں اردو میرا Optional مضمون تھا۔کورس میں ''دیوان حالی'' تھا۔ ہفتے میں دوبارہ پڑھنے کی نوبت آتی تھی۔حالی سا زاہد خشک اور پڑھانے والے ڈاکٹر عنایت اللہ، سونے پر سہاگہ تھا۔ڈاکٹر صاحب میرے کرم فرما ہیں اور میں ان کا نیاز مند ہوں لیکن اس عقیدت کے باوجود میں نے ان کا قصور آج تک معاف نہیں کیا۔اپنی بے ذوقی کے سبب انہوں نے مجھے حالی سے محبت کی بجائے اس سے دُور ہو جانے پر مجبور کر دیا۔اختر شیرانی کی کتابیں پڑھنے والے کو کلام حالی ویسے بھی زیادہ پسند نہ آسکتا تھا لیکن اگر پڑھانے والے بھی ایسے ہوں تو پھر سبحان اللہ!!

خدا مولوی کریم بخش صاحب کا بھلا کرے کہ اسی زمانے میں حج کو تشریف لے گئے اور ڈاکٹر صاحب پوری طرح شعبۂ عربی کی طرف چلے گئے۔ ''راوی'' کے ایک سابق مدیر ریاض احمد (جو ان دنوں مقابلے کے امتحان سے فارغ ہوئے تھے) ہمیں پڑھانے پر لگائے گئے۔ وہ تھوڑا عرصہ رہے لیکن مجھے حالی سے پھر قریب لانے کا باعث یہی تھے۔امتحان سے کامیابی پر وہ کہیں ڈپٹی کمشنر ہو کر چلے گئے۔

اس زمانے میں مجھے فارسی سے زیادہ لگاؤ ہوا۔صوفی غلام مصطفیٰ تبسم ہمیں فارسی پڑھاتے تھے۔ان کا فارسی کا ذوق بہت اچھا تھا۔ چنانچہ مجھے اس زمانے میں فارسی کا زیادہ شوق ہو گیا لیکن یہ استفادہ صرف کلاس کی حد تک تھا۔

حالی کے کلام سے کچھ نہ کچھ تعلق اس زمانے میں رہا۔ہم جماعتوں میں اس زمانے میں جن سے زیادہ بحثیں ہوتی تھیں وہ عنایت اللہ شاہد تھے۔ یہ حالی کے بڑے معتقد تھے اور اس بارے میں میری ان کی اکثر بحث ہوتی تھی۔ (دیوان حالی کا وہ نسخہ جو ان دنوں میں نے خریدا تھا اب تک میرے پاس ہے اور اس کے حاشیے پر شاہد کے کئی منتخب شعر درج ہیں)۔حالی سے بدظنی تو جاتی رہی لیکن پرستاری کی نوبت نہ آسکی۔

کالج کے ابتدائی دور میں، بہت کم آمیز بھی تھا۔دو چار دوستوں کے سوا کالج میں کسی سے بات کرنے کی بھی نوبت نہ آتی تھی۔اس کے اسباب پر غور کرتا ہوں اور سوچتا رہ جاتا ہوں محتسب کا یہ ارشاد کہ اپنی بات سرِ عام لانے سے فائدہ اور عقل وخرد کی یہ ضد کہ اس میں ہرج ہی کیا ہے یہ گھڑی یوم الحساب سے کم نہیں لیکن سچ بولنے کا تہیہ کر ہی لیا ہے تو اب صاف صاف کہہ دینے میں بُرائی کیا ہے؟ کیا یہ کم آمیزی ایک ''ناز پروردہ'' کی کم آمیزی ہے جو باہر کی دنیا سے ربط قائم کرنے سے گریز کرتا ہے یا اس کا سبب جسم کا وہ ڈیل ڈول ہے جس کا آغاز ۱۹۳۵ء ہی سے خاندانی روایت کے طور پر ہو گیا تھا؟ مجھے شدت سے احساس تھا کہ نئے لوگوں سے ملنا، مجلس میں باتیں کرنا، مشاعروں میں شعر پڑھنا یہ سب میرے اختیار

سے باہر ہے اس کا اثر یہ تھا کہ کالج کی ابتدائی زندگی میں کالج کے بھرپور مشاغل سے میرا تعلق نہ تھا۔
میں نے اپنی حالت پر غور کرنا شروع کیا۔ تعلیمی تگ ودو بھی تیز ہوگئی اور انعامات کی بارش بھی ہونے لگی میں نے تنہائی اور علیٰحدگی کے خول کو توڑنا شروع کر دیا اب باہر کی دُنیا سے ربط بڑھایا جانے لگا اپنے عجز کو میں نے Rationalize کرنا چھوڑ دیا تھا۔ تاریخ، منطق، اردو نثر، اردو شاعری، قدیم وجدید تنقید، (اردو، انگریزی) انگریزی شاعری، فارسی شاعری، فارسی افسانہ اور نفسیات کی کتابیں بے تحاشا پڑھنے لگا۔ ایف اے کے زمانے میں جو تعلیمی پس ماندگی پیدا ہوگئی تھی اسے دُور کیا۔ اب ہم جماعتوں سے بے تکلف بھی ہونے لگا کبھی کبھار کالج کے مشاعروں میں بھی پڑھ لیتا تھا۔ کالج کی ادبی مجالس میں بھی حصہ لیتا تھا۔ غرض کہ نفسیات کے مطالعے نے میری رہنمائی کی اور میں ایک اچھا شہری بننے کی کوشش میں لگ گیا۔ فرائڈ، ایڈلر اور میک ڈوگل کو اسی زمانے میں پڑھا اور برتا۔ اب رسائل میں غزلیں شائع ہونے لگیں۔ کالج میگزین (راوی) کے علاوہ میرا کلام شاہکار میں بھی شائع ہوا ڈیڑھ دو ہزار کتابیں میری نظر سے گزر گئیں۔ حالی اور شبلی کی تمام کتابیں بھی اُسی زمانے کی دیکھی ہوئی ہیں۔ کالج لائبریری کے علاوہ یونیورسٹی لائبریری سے بھی فائدہ اٹھانے لگا اور ذاتی لائبریری بھی برق رفتاری سے بڑھنے لگی۔ ایک جنون تھا کہ دن رات طاری تھا۔ اول اول گھر والوں نے میری صحت کے خیال سے مجھے روکنا چاہا لیکن آخر اس شوق بے نہایت کے سامنے انہوں نے سپر ڈال دی۔
اس زمانے میں حالی سے زیادہ مجھے شبلی پسند تھے۔ یہ حالی سے میری چوتھی ملاقات تھی۔
پھر ایم۔ اے فارسی (۱۹۴۵ء۔۱۹۴۶ء) کا زمانہ آیا۔ اب والد صاحب تبدیل ہو کر سیالکوٹ کے ضلع میں چلے گئے اور میں نیو ہوسٹل میں چلا آیا۔ نیو ہوسٹل (۱۹۴۶ء) کو اڈرینگل (۱۹۴۷ء) ولنر ہوسٹل (۱۹۴۷ء۔۱۹۵۰ء) میں جو دن بسر ہوئے وہ میرے لیے بہت اہم تھے۔ کم آمیزی کا مکمل علاج اسی دور میں ہوا۔ اس تبدیلی سے میرے لیے ماحول زیادہ خوشگوار ہوگیا۔ اب علمی تگ ودو کے لیے زیادہ سازگار فضا پیدا ہوگئی۔ شبلی کی ''حیات معاشقہ'' پر ۱۹۴۵ء کے اواخر میں لکھ چکا تھا، پھر دوسرے مضامین کی نوبت آئی۔ انگریزی تنقید کو اسی زمانے میں انہماک سے دیکھا۔ ٹی۔ ایس ایلیٹ۔ سی ڈے لیوس، ایف آر لیوس، ہربرٹ ریڈ پڑھے گئے اور تنقیدی شعور میں وسعت پیدا ہوگئی۔ اب میرے لیے شاعری ذاتی پسند اور ناپسند کا سوال نہ رہی بلکہ ذوق کے وسیع تر پیمانے میرے رہنما تھے۔
سید عابد علی، ڈاکٹر اقبال مرحوم، ڈاکٹر عبداللہ اور عباس ابن محمد تقی شوشتری ان مختلف مذاق کے اساتذہ سے استفادہ کیا۔ ڈاکٹر اقبال، ڈاکٹر عبداللہ اور شوشتری صاحب نے تحقیق کے اصولوں سے باخبر کیا اور فارسی شاعری اور نثر کے مطالعے میں ایک خاص نہج پر ڈال دیا۔ شیرانی صاحب، شفیع صاحب اور ڈاکٹر اقبال صاحب نے اورینٹل کالج میں ریسرچ کا ایک خاص دبستان قائم کیا تھا۔ ریسرچ میں ان سے متاثر

ہوں لیکن اسلوب میں ادبیت اور تنقید کی شمولیت کچھ عابد صاحب کی رہنمائی اور کچھ اپنے گذشتہ رجحانات کی مرہونِ منت ہے۔ اس زمانے میں ڈاکٹر عبداللہ صاحب کی تحریک پر میں نے اردو تذکروں کو دیکھا اور ان پر مضامین لکھے۔ ڈاکٹر صاحب کا یہ ''کٹھ ملائی'' کا دور تھا۔ تنقید اور اس کے اصولوں سے بدکتے تھے اور زبان کی اس تبدیلی کو جو ۱۹۳۵ء کے لگ بھگ شروع ہو چکی تھی جسارت سے تعبیر کرتے تھے۔ عابد صاحب ان کے مقابلے میں دوسری انتہا پر تھے اور مجھے تنقید ہی کی طرف لے جانا چاہتے تھے۔ الحمدللہ کہ دونوں بزرگوں کی توقعات پوری نہ ہوسکیں اور میں نے اپنے لیے جدا راستہ بنا لیا۔ فارسی ادب کے شوق اور اردو کی لگن نے نہ پوری طرح تحقیق کی طرف جانے دیا نہ میں پوری طرح تنقید کا ہو سکا۔ آئندہ میرا مطالعہ ان دو راستوں پر تھا۔ میں نے دونوں نقطہ ہائے نظر کے امتزاج سے اپنی راہ نکالنے کی کوشش کی ہے۔

حالی کو میں نے اسی سنگھم پر کھڑے ہو کر دیکھا ہے۔ ان سے یہ میرا پانچواں تعارف ہے۔ اب حالی کی نثر اور ان کی شاعری میرے لیے دوگونہ دلچسپی کا سبب ہو گئی۔ ایک طرف تو ان کے مقالات و کتب کا تحقیقی پہلو میرے لیے جاذبِ نظر تھا دوسری طرف ان کے تنقیدی بیانات کا جائزہ میرا محبوب موضوع ہو گیا۔ جیسے جیسے میرا مطالعہ گہرا ہوا بچپن کے تعصبات چھٹنے لگے۔ حالی اب میرے لیے زیادہ واضح رنگوں میں اُبھر آئے۔ ان کی تحقیق کی عظمت کا رعب ختم ہوا۔ رفتہ رفتہ ان کے تنقیدی معیار بھی حقیقت کی روشنی میں دکھائی دینے لگے۔ میں نے حالی کے سارے دور کو کھنگالنا شروع کیا۔ سرسید، محسن الملک، وقار الملک، چراغ علی، شرر، مولوی نذیر احمد، رتن ناتھ سرشار اور مرزا رسوا سب ایک ایک کر کے دیکھے، شبلی اور حالی کو میں نے اس پس منظر میں رکھ کر دیکھا۔ تاریخ کا مطالعہ بھی چل رہا تھا۔ مختلف عوامل کو ملا کر دیکھنے سے اس دور کے بعض غیر واضح پہلو آشکار ہوئے۔ نفسیات کے مطالعے نے افراد کو Objective، انداز میں دیکھنے کی بصیرت دی۔

میری ''خودنگری'' زیادہ صحت مند راستوں پر آ گئی۔ مجلس آرائی ہوسٹل کی زندگی، احباب کی گپ شپ، فقرے بازی ہنسی مذاق ان سے طبیعت کا غبار نکل جاتا تھا۔ مطالعے کا پھیلاؤ غرور آمادہ کر سکتا تھا لیکن خانہ نشینی نہیں تھی اس لیے ''خودنگہی'' نخوت سے ہم کنار نہ ہوئی بلکہ ''پرعظمت علیحدگی'' کا روپ اختیار کر کے تجزیے میں کام آئی۔ حالی کی ذات اور ان کے کام کو ایک پرستار کے طور پر نہیں ایک نقاد کے طور پر دیکھنے کا شعور پیدا ہوا۔ میری اُفتادِ طبع کے لیے یہ چیز کافی نہ تھی اس لیے جذبات کا لاوا ادھر سے ہٹ کر بے باکی، صاف گوئی اور اندازِ بیان کی شوخی میں آ گیا اگر اسے ادھر راستہ نہ ملتا تو ممکن ہے یہ رنگ طبیعت مبالغہ آمیزی کی طرف جھکتا اور اس سے تنقیدی اقدار میں اختلال پیدا ہوتا۔ اس اختلال سے بے رحمانہ بے باکی مجھے زیادہ عزیز ہے۔ یہ اندازِ بیان کھرے کھوٹے کی تمیز میں بڑے چھوٹے کا لحاظ

نہیں کرتا۔ اس سے پڑھنے والے کی اخلاقی اقدار کو دھکا ضرور لگتا ہے لیکن کیا کیا جائے یہ میرے اسلوب کا لازمی حصہ ہے مجھے یہ بتایا گیا ہے کہ میرے قلم کی شوخی اور لہجے کی تندی عام پڑھنے والے کے معتقدات کو چھیڑنے اور اسے اشتعال دلانے کا سبب بھی بنتی ہے یہ عام پڑھنے والے کے بارے میں ممکن ہے صحیح ہو محتاط قاری اس سے کبھی ہراساں نہیں ہوتا۔ اس کے نزدیک ہر مقالہ ایک ادب پارہ بھی ہے اور تنقید محض سائنسی عمل نہیں ایک ادبی عمل بھی ہے۔ اس تنقید کا پہلا باقاعدہ نمونہ شبلی کی ''حیات معاشقہ'' ہے۔ اس کے بعد پڑھنے کا سلسلہ تیز اور لکھنے کا دھیما پڑ گیا۔ ۱۹۴۶ء کے آخر اور ۱۹۴۷ء کے اوائل کا وقت ایم اے تاریخ کی تیاری میں صرف ہوا۔ مجھے ہندوستان کی تاریخ سے خصوصی لگاؤ ہو گیا۔ شاعری تنقید اور فارسی کی کتابیں بھی دیکھتا رہتا تھا۔ ٹی ایس ایلیٹ کی شاعری آوطن کی نظمیں ایزرا پاؤنڈ کا کلام میرے پیش نظر تھے۔ ہندوستان کی تاریخ کے بنیادی مآخذ کے علاوہ اردو تنقید اور اردو شاعری بھی میرے زیر مطالعہ تھی۔ اس زمانے میں نثر لکھنے کا موقع کم ملا۔ البتہ پچھلے ایک آدھ سال سے شعر گوئی زیادہ ہو رہی تھی اور ہر روز دو تین نظمیں ہو جاتی تھیں۔

۱۹۴۷ء سے الفرڈ پٹیالہ ریسرچ اسکالر ہوا۔ فارسی کا انشائی ادب میرا موضوع قرار پایا۔ تاریخ ہند، تاریخ ایران و عرب اور فارسی ادب میرے موضوع تھے۔ دیوان الانشا کی تاریخ اورنگ زیب کی وفات تک دریافت کی جانے لگی اور اس محکمے کے نوشتہ جات کا ادبی مطالعہ بھی ہونے لگا۔ اسلوب کے بارے میں انگریزی سرمایہ اسی زمانے میں دیکھا۔ اس کے علاوہ آئی اے رچرڈز کی The Philosopy of Rhetoric اور دوسری کتابیں بھی دیکھ ڈالیں۔ تین چار مہینے آئی اے رچرڈز کی کتابوں میں لگ گئے اس پس منظر نے میرے تحقیقی مقالے کے تنقیدی حصے کو نکھار دیا۔ دیوان الانشا کی تاریخ خالص تاریخی حصہ تھا۔ اس کے لیے ہندوستان کی سلطانی اور مغلیہ دور کی تاریخ کے بنیادی مصادر اس زمانے میں بغور پڑھے پڑھنے ہندوستان کے فارسی ادب کے ذخائر کا مفصل مطالعہ کیا گیا۔ یہ کام زیادہ تر ڈاکٹر عبداللہ اور کم تر ڈاکٹر اقبال کی نگرانی میں ہوا۔ اس دور میں حالی کی طرف سے میں غافل رہا۔ ۱۹۴۸ء میں ڈاکٹر اقبال وفات پا گئے۔ ڈاکٹر عبداللہ پرنسپل ہوئے۔ ایم اے فارسی کو مضمون نویسی اور تاریخ ادب پڑھانے کا کام میرے سپرد ہوا۔ مولانا فیوض الرحمٰن جن سے اسی زمانے میں علم معانی کے درس لیے تھے بیمار ہوئے تو منشی فاضل کو ابوالفضل پڑھانے کا کام بھی میرے ذمے ہوا۔

ادیب فاضل کی کلاسوں کا اجراء ہوا تو مقدمہ شعر و شاعری پڑھانے کا کام بھی مجھے سونپا گیا۔ ریسرچ کے ساتھ ساتھ یہ مشاغل بھی چلتے رہے۔ اس طرح ایک بار پھر مجھے حالی کی کتابیں دیکھنے کا موقع میسر آ گیا۔ جب پروفیسر شوشتری ایران سے لوٹ کر پرنسپل ہوئے تو بھی یہ تدریس کے سلسلے اسی طرح بحال رہے۔ اب میری ریسرچ کے نگران شوشتری صاحب تھے ان کی بینائی زائل ہو چکی تھی اس لیے زیادہ

فائدہ اب بھی ڈاکٹر صاحب سے اٹھاتا تھا۔ ڈاکٹر صاحب کی تحقیق نے مجھے متاثر کیا۔

مجھے اپنی جگہ اس کا اعتراف یہ ہے کہ ان کی تحقیق اور ان کے مطالعے کی وسعت نے مجھے بہت فائدہ پہنچایا ہے۔ اب وہ کٹھ مٹھے بھی نہ رہے بلکہ انگریزی تنقید نے ان کے مطالعے میں ایک انقلاب آفریں تبدیلی پیدا کر دی ہے۔

آئی اے رچرڈز کے مطالعے نے مطالعۂ حالی میں عقیدت مندی کو صدمہ پہنچایا لیکن مجھے اس بات کی خوشی بھی ہے کہ مجھے اپنے خیالات پر نظر ثانی کا موقع ملا۔ زندگی کے کسی اور مرحلے پر میں اس ترمیم و تنسیخ کے عمل کو ممکن ہے اتنی آسانی سے قبول نہ کرتا لیکن اس موقعے پر اپنے خیالات پر نظر ثانی مجھے آسان معلوم ہوئی۔ تحقیق کے جن اصولوں کو ڈاکٹر اقبال اور ڈاکٹر عبداللہ سے حاصل کیا اس نے نظر ثانی کا حوصلہ پیدا کر دیا۔ دوسرے کی غلطی کی نشان دہی اور اپنی غلطی کا اعتراف، یہ خوبی ان بزرگوں کے مسلک کی نمایاں خصوصیت رہی ہے۔

حالی کے بارے میں میرا نقطۂ نظر اس منزل پر آ کر ذاتی تعصبات اور جذباتی الائشوں سے پاک ہو گیا۔ اب میں حالی کو ایک نقاد کی حیثیت سے دیکھتا ہوں ان سے مرعوب نہیں ہوتا بلکہ ان کے نظریات کو تنقید کی کسوٹی پر بے تکلفی سے پرکھنے کی کوشش کرتا ہوں۔ انداز بیان کی یہ بے تکلفی میرے مزاج کا حصہ ہے۔ جو کچھ میں نے اب تک اپنے بارے میں عرض کیا ہے۔ اس کی روشنی میں میرے انداز بیان کو دیکھنے کی ضرورت ہے کہنے والے کہتے ہیں کہ مجھے معایب کی تلاش ہوتی ہے۔ محاسن سے سروکار نہیں ہوتا۔ حالانکہ یہ درست نہیں۔ معایب کے بیان میں رورعایت اور مصلحت اندیشی کو میں پسند نہیں کرتا اور کٹتے ہوئے جملوں کو بھی بے تکلف استعمال کرتا ہوں۔ اس سے قاری کی نظر میں معایب کا حصہ زیادہ ابھر آتا ہو تو قاری کو محتاط ہو کر میری تحریریں پڑھنی چاہییں۔ انہیں مضامین میں محاسن بھی دکھائی دیں گے۔ محاسن کے اظہار میں بھی کبھی بخل سے کام نہیں لیا گیا۔ ہاں اتنا ضرور ہے کہ میں پڑھنے والے کے عقیدت مندانہ جذبات کی پروا نہیں کرتا۔ مانگے تانگے کی آراء جن پر اکثر پڑھنے والوں کا تکیہ ہوتا ہے اس کا میں لحاظ نہیں کرتا۔ میں حالی کو اس کے اصلی روپ میں دیکھنا چاہتا ہوں۔ آپ ان کی شاعری کو اس لیے بھی پسند کر سکتے ہیں کہ آپ کو حالی کی نصیحتیں پسند آتی ہیں اس لیے بھی پسند کر سکتے ہیں کہ ان کی شخصیت اور مرنجاں مرنج طبیعت آپ کو بھا جاتی ہے۔ میں ان کی ان حیثیتوں کو آپس میں گڈ مڈ نہیں کرتا۔ میرے نزدیک حالی کی شاعری کا ہر دَور پسندیدہ نہیں۔ میں ان کے کلام کو تاریخی ترتیب سے دیکھتا ہوں اس میں مجھے تین منزلیں دکھائی دیتی ہیں۔ جاندار شاعری صرف وسطی دور کی ہے آخری دور کی شاعری محض آخرت کا توشہ ہے شاعری نہیں۔ ان کی شخصیت اگر مجھے پسند ہے تو اس کا یہ مطلب کیوں لیا جائے کہ میں ان کے ہر کارنامے کو وحی والہام سمجھتا ہوں:

سلف لکھ گئے جو قیاس و گماں سے
صحیفے ہیں اُترے ہوئے آسماں سے

حالی کی تنقید بھی میرے لیے صحیفۂ آسمانی نہیں ہے اس موقع پر مجھے حالی کے نقادوں سے بھی عرض کرنا ہے میں عام پڑھنے والوں کے اعتقادات کی جگالی اپنے لیے قابلِ فخر نہیں سمجھتا۔ حالی کے ناقدانہ شعور میں مجھے بعض نقائص دکھائی دیتے ہیں۔ ان کے اظہار کو میں ضروری سمجھتا ہوں۔ علاوہ ازیں کیا یہ ضرور ہے کہ مولانا حالی کی شہرت کو ان انتقاد کی اچھائی برائی کا معیار بنالیا جائے؟ حالی کی بعض خامیاں ان کے دوسرے معاصرین میں اور ان میں مشترک میں بعض صرف حالی سے مخصوص ہیں۔ حالی منطقی مغالطوں کا شکار بھی تھے۔ قدیم وجدید کے امتزاج میں اکثر جگہ وہ غلطی کھا گئے ہیں، اپنی طبیعت کی بعض مجبوریوں کے سبب وہ بعض عناصر کے تجزیے میں ناکام رہے ہیں، ان کا احساس ہمارے اکثر نقاد کرتے ہیں لیکن یہ تو تجزیے کی منزل ہے قدر و قیمت کا فیصلہ کرتے وقت تو خیالات کی صحت وعدم صحت کا اقرار کرنا ہی پڑے گا۔ ہمارے ہاں تجزیے اور تعین اقدار کے اس فرق کو نظر انداز کر دیا جاتا ہے، حالانکہ اس آخری منزل پر آکر نقاد کا کام عذر پیش کرنا یا جواز ڈھونڈنا نہیں بلکہ کھرے کھوٹے میں فرق کرنا ہے۔ حالی کا اثر اردو تنقید پر بہت ہے لیکن اس کا یہ مطلب تو نہیں کہ ان کی اس شہرت کو ان کے نظام تنقید کی صحت کا ضامن بھی قرار دے لیا جائے، شہرت و مقبولیت کے دوسرے کئی عوامل بھی ہوتے ہیں۔

حالی انسان تھے ان سے جو غلطیاں سرزد ہوئیں ان کے لیے عذر پیش کرنا حالی کی مدافعت تو ہے حقیقت کا انکشاف ہرگز نہیں ہے کیونکہ تنقید آخر مدافعت یا عذر گناہ تو نہیں حقیقت کو دیکھنے اور پرکھنے کا نام ہے۔

وعظ و نصیحت کے ان قطب میناروں سے اتر کر دیکھیں تو مطالعہ حالی میں محاسن بھی ملیں گے اور معایب بھی۔ ان کی مسکین نہاد وضع دل کو لبھانے والی ہے ان کی غزل کے بعض شعر بڑے پُر لطف ہیں۔ ان کا مرثیۂ غالب اردو کے بہترین مراثی میں شمار ہونا چاہیے۔ مسدس حالی کے بعض بند خاصے کی چیز ہیں لیکن نثار حالی اور شاعر حالی میں بڑا فرق ہے۔ اشعار میں تو وہ نظریۂ شعر کے بارے میں بھی خاصا سلجھا ہوا فکری نظام رکھتے ہیں لیکن نثر میں آکر یہی باتیں الجھی ہوئی اور بے ترتیب ہو کر رہ جاتی ہیں پھر نقاد حالی اور محقق حالی میں بھی فرق ہے حالی کی تحقیق بھی ہر جگہ قابل ستائش نہیں ہے۔ ان کی کتابوں میں حیات سعدی سب سے اہم ہے وریہی کتاب قابل تعریف بھی ہے اس میں تحقیق کے اس بنیادی اصول کی پیروی کی گئی ہے کہ معلومہ مواد کو پوری طرح چھان بین کے بعد درج کیا گیا ہے۔ اگرچہ اب سعدی پر اس سے زیادہ تحقیق ہو چکی ہے لیکن اس کی حیثیت اپنی جگہ پر ہے اس کے مقابلے میں حیات جاوید اور یادگار غالب اس اعتبار سے ناقص کتابیں ہیں ان میں معلومہ مواد سے بھی پورا پورا فائدہ نہیں اٹھایا گیا۔ اگر یہ استدلال صحیح ہے (اور بظاہر اس کے صحیح ہونے میں شبہ نہیں ہونا چاہیے) تو پھر حالی کی تحقیق ہر جگہ

قابل اعتبار نہیں ہے۔

حالی کی تنقید کا حال بھی زیادہ مختلف نہیں ہے۔ ان کے تنقیدی نظام میں بھی بعض قباحتیں موجود ہیں جن سے ان کے نتائج کی افادی حیثیت مشتبہ ہو جاتی ہے۔ حالی تنقید کی کسوٹی پر اتنے کھرے ثابت نہیں ہوتے جتنے شاعری میں تھے۔ ان کی شاعرانہ عظمت ان کی ناقدانہ حیثیت سے بہر حال ارفع ہے۔ یوں عقاید کی بات دوسری ہے سچ کی خاطر اپنے عقاید کو صلیب پر چڑھانا ہی پڑتا ہے۔ میں بھی دوسروں کی بنی بنائی آرا سے متاثر ہوتا رہا ہوں لیکن جب ان خیالات کی صداقت کو پرکھنے کا موقع آیا ہے اور میرے پرانے عقاید متزلزل ہوئے ہیں تو اس کا دکھ اور صدمہ مجھے بھی ہوا ہے لیکن سچ کو مان لینے میں ہرج ہی کیا ہے۔

نکل جاتی ہو سچی بات جس کے منہ سے مستی میں
فقیہ مصلحت بیں سے وہ رند بادہ خوار اچھا

(ظفر علی خانؒ)

بات کہیں سے کہیں نکل گئی۔ اصل قصہ یہ تھا کہ حالی کی تدریس کے زمانے میں مرزا ادیب سے واقفیت ہوئی۔ ان کے کہنے پر ادب لطیف کے ۱۹۵۰ء کے سالنامے کے لیے "حالی کی تنقید" کے عنوان سے مقالہ لکھا۔ مرزا صاحب شاید یہ توقع رکھتے تھے کہ میں ان کے خیالات کی ترجمانی کروں گا۔ مضمون دیکھ کر انہیں مایوسی ہوئی۔ چنانچہ مقالے کو روک لیا گیا اور بعد میں یہ مضمون جولائی کے پرچے میں چھپا اس پر مرزا صاحب کی طرف سے ایک اختلافی نوٹ بھی تھا۔ اس کے بعد ۱۹۵۳ء میں مقدمہ شعر و شاعری کے ایک خاص ایڈیشن کی تحریک ہوئی۔ جو ۱۹۵۴ء میں چھپ گیا اس کے علاوہ بھی حالی پر مقالے لکھے گئے:

۱۔ شبلی اور حالی کے ہاں تنقیدی اصطلاحات۔ ادبی دنیا		۱۹۴۶ء
۲۔ حالی کی تنقید۔ ادب لطیف	جولائی	۱۹۵۰ء
۳۔ حالی کی شخصیت۔ دستور		۱۹۵۳ء
۴۔ حالی۔ غریب شہر۔ ماہ نو		۱۹۵۵ء
۵۔ یادگار غالب۔ ایک تحقیقی مطالعہ۔ سویرا		۱۹۵۷ء

اور اب یہ مقالہ بھی حالی ہی پر ہے یا شاید اپنے آپ پر ہے اپنی بات چلی ہے تو اتنا اور کہنے کی جرأت کرتا ہوں کہ حالی میرے مطالعے کا صرف ایک حصہ تھا، یہی سب کچھ نہ تھا۔ اب بھی کہ ایک ہی مصنف کو لے کے بیٹھ رہنے کی وبا عام ہو رہی ہے تمام عمر حالی پر لکھتے رہنا اور لکھتے چلے جانا میرے بس کی بات نہیں۔ صرف حالی میرا موضوع نہ تھا، نہ آئندہ اسے عمر بھر کا روگ بنانے کی تمنا ہے۔ حالی کے سوا بھی ابھی دنیا میں بہت کچھ ہے اور اردو ادب میں تو ابھی کام کی گنجائشیں اور بھی زیادہ ہیں۔

قاضی سراج الدین احمد

(۱)

سرسید کے ساتھیوں میں محسن الملک، وقار الملک، حالی، نذیر احمد، شبلی، مولوی چراغ علی اور قاضی سراج الدین قابل ذکر ہیں۔ محسن الملک اور وقار الملک، کے حالات عام طور پر معلوم ہیں بلکہ مولوی محمد امین زبیری ان بزرگوں کے مفصل حالات کتابوں کی صورت میں شائع بھی کر چکے ہیں۔ حالی اور شبلی پر بھی متعدد کتابیں نکل چکی ہیں۔ تذکرۂ شمس العلماء خواجہ حالی (امین زبیری) تذکرۂ حالی (محمد اسماعیل پانی پتی) اور یادگار حالی (صالحہ عابد حسین) خاص طور پر ذکر کے قابل ہیں۔ شبلی پر امین زبیری، سید سلیمان ندوی اور شیخ اکرام ایک ایک دو دو کتابیں لکھ چکے ہیں۔ خود سرسید بھی اتنے ہی خوش قسمت تھے ان پر کتابوں کا ایک انبار موجود ہے۔ ڈپٹی نذیر احمد پر بھی افتخار عالم کی حیات النذیر موجود ہے۔ لیکن دو آدمیوں کو عام طور پر نظر انداز کیا گیا ہے۔ مولوی چراغ علی پر اکا دکا مضمون ضرور نکلے ہیں لیکن ان کی جو حیثیت سرسید کے گروپ میں تھی اور جس کا اعتراف اس دور کے کم و بیش ہر لکھنے والے کو ہے، اس کا تفصیلی جائزہ ابھی تک نہیں لیا گیا۔ سرسید اگر علی گڑھ تحریک کا دل تھے تو مولوی چراغ علی بلاشبہ اس کا دماغ کہے جاسکتے ہیں۔ وہ متعدد اروپائی اور ایشیائی زبانوں کے ماہر ہی نہیں تھے دینی معاملات میں ان کا مطالعہ ساری تحریک کو ایک مذہبی سطح پر لے آیا۔ علمیت کے اعتبار سے ان کا پایہ سرسید گروپ میں بلند ہے۔ قاضی سراج الدین اگرچہ علم وفضیلت میں مولوی چراغ علی، حالی، شبلی اور خود سرسید کی ٹکر کے نہ تھے لیکن وہ بھی اپنے ساتھیوں کے دوش بدوش سرسید کے خیالات کی ترویج میں منہمک رہے بلکہ سرسید کے خیالات کی نشر واشاعت میں وہ حالی سے زیادہ سرگرم دکھائی دیتے ہیں ان کا انگریزی کا مطالعہ خاصا تھا۔ اس گروپ کے ہمراہ وہ بھی مغربی خیالات کو مقامی روایات میں سمونے میں کوشاں رہے۔ انگریزی سے ان کی براہ راست واقفیت تھی اور وہ شبلی اور حالی سے زیادہ سرسید کے مغربی اثرات کو اخذ کرتے رہے لیکن ان کی اردو تحریر میں نہ شبلی کا ساطنطنہ ہے نہ حالی کی سی عربی کی دسترس ہے انکا تحریری سرمایہ اگرچہ بہت زیادہ نہیں ہے۔ حالات وواقعات کی تیز رو نے ان کے تحریری سرمائے کو قصۂ پارینہ بنادیا ہے بلکہ

اس دور کی تخلیقات میں قاضی صاحب کے حالات بھی نہیں ملتے۔ سرسید کے رقعات اور مکتوبات حالی میں البتہ ان کا ذکر آتا ہے۔ دور حاضر کے مصنفین میں قاضی صاحب کا چلتا ہوا سا ذکر ڈاکٹر سید عبداللہ صاحب کی کتاب ''سرسید کا اثر اردو نثر پر'' (انگریزی) میں ہے۔ اسی طرح سید سلیمان ندوی کی ''حیات شبلی'' اور ''البصیر'' کے شبلی نمبر میں قاضی صاحب کے بارے میں کچھ مواد ملتا ہے۔ سبب شاید یہ ہے کہ قاضی صاحب سرسید کی تحریک کے باقاعدہ کارکن نہ تھے اور علی گڑھ کالج کی تشکیل و تعمیر میں انہوں نے براہ راست کوئی حصہ نہیں لیا۔ لیکن اس دور کے ادب میں جو سرسید کے زیر اثر تخلیق ہوا قاضی صاحب کی کتابوں کا بھی شہرہ ضرور تھا۔

(۲)

مولانا حالی کو مقدمہ شعر و شاعری لکھنے کا خیال آیا تو ان کی نظر علی گڑھ کے اکابر کی طرف اٹھنے سے پہلے قاضی سراج الدین کی طرف گئی اور وہ ۲۱ اپریل ۱۸۹۲ء کے بعد منشی سراج الدین کے پاس ناہن روانہ ہوئے۔ ۷ امئی ۱۸۹۲ء کے ایک خط میں ناھن سے لکھتے ہیں:۔

''میں ایک روز جگادھری میں رہا۔ وہاں سے آکر ساڈھورا میں ٹھہرا۔ منشی سراج الدین بھی وہاں پہنچ گئے تھے۔ کل دس بجے دن کے میں اور وہ اور سب ہمراہی مع الخیر ناھن میں پہنچے۔ یہاں گرمی تو کسی قدر کم ہے مگر آندھی برابر چلتی رہی ہے۔ ابھی میں منشی صاحب کے مکان میں مقیم ہوں۔ لیکن شاید کل دوسرے مکان میں چلا جاؤں۔ جب تک مینہ نہیں برستا یہاں کچھ لطف نہیں ہے۔''

حالی منشی صاحب کے مکان سے علیحدہ مکان میں اٹھ آئے۔ یہ نقل مکانی ۲۳ مئی ۱۸۹۲ء کو پیش آئی اس کا ذکر مولانا حالی نے ۲۷ مئی ۱۸۹۲ء کے خط میں کیا ہے جو مطبع سرمور گزٹ سے لکھا گیا۔ یہاں پر مولانا کا قیام ۴ جولائی ۱۸۹۲ء کے بعد تک رہا لیکن ۳۰ اگست ۱۸۹۲ء سے قبل مولانا پانی پت لوٹ آئے تھے۔ ناھن کے اس قیام پر مولانا حالی کا ڈیڑھ سو روپیہ خرچ ہوا تھا جس کا ذکر انہوں نے خواجہ تصدق حسین کے نام خط میں کیا ہے۔ مقدمۂ شعر و شاعری کی تالیف میں انگریزی ماخذوں سے استفادہ مولانا حالی نے دوسرے لوگوں کی مدد سے بھی کیا ہے۔ ناھن میں ان کا قیام بھی غالباً اسی غرض سے تھا۔

(۳)

قاضی سراج الدین کے تعلقات سرسید اور حالی سے اس زمانے میں ہوئے جب قاضی صاحب ناھن میں مقیم تھے۔ سرسید کی وفات تک آپس کی خط و کتابت بدستور جاری رہی بلکہ سرسید تصنیفی کاموں کی

طرف انہیں خاص طور پر لگایا کرتے تھے۔ قاضی صاحب کے نام سرسید کے خطوط قاضی صاحب کی اولاد سے ضائع ہو گئے ہیں اس لیے اس پہلو پر زیادہ تفصیل سے روشنی نہیں ڈالی جا سکتی۔ خاندان والوں کا بیان ہے کہ ان خطوں میں سرسید نے قاضی صاحب کے تصنیفی کام کی بہت زیادہ تعریف کی تھی بلکہ یہ بھی لکھا کہ پنجاب میں قاضی سراج الدین کے علاوہ اگر ایک اور آدمی بھی میری تحریک کا چلانے والا ہوتا تو سارے پنجاب کو بآسانی مسخر کیا جا سکتا تھا۔ قاضی صاحب کے نام کے خطوط ''خطوط سرسید'' مرتبہ سرراس مسعود میں موجود ہیں۔ یہ کل پانچ خط ہیں جن سے سرسید اور قاضی صاحب کے دوستانہ تعلقات پر تو روشنی پڑتی ہے لیکن مذکورہ بالا دعوے کی تائید نہیں ہوتی۔

قاضی سراج الدین کے حالات کے ماخذ مذکورہ بالا کتابوں کے علاوہ یادرفتگاں کا قلمی نسخہ، راولپنڈی کے ڈپٹی کمشنر کی رپورٹ اور قاضی صاحب کے پوتے اعجاز فاروقی کی مہیا کردہ زبانی روایات اور کچھ تحریری یادداشتیں ہیں۔ یادرفتگان میں ان کے ادبی کام کا ذکر نہیں ہے صرف گھریلو حالات اور ملازمت کا حال لکھا ہے، وہ بھی بہت مختصر ہے تاہم مختلف ماخذوں کو ملا کر قاضی صاحب کے حالات پر کچھ روشنی پڑتی ہے۔ اعجاز فاروقی کے قول کے مطابق یادرفتگان ان کے والد (یعنی قاضی سراج الدین کے فرزند اکبر) رشید احمد فاروقی صاحب کی تصنیف ہے۔ ۲۲ ورق کی یہ مختصر کتاب فاروقی صاحب کی وساطت سے مجھے استفادے کے لیے ملی۔ اس کی کتابت ان کے رشتے کے بھائی قاضی محمد لطیف صاحب (قاضی صاحب کے نواسے) نے کی ہے۔ کتاب کا بغور مطالعہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ قاضی سراج الدین احمد کی یہ سوانح عمری مولانا غلام محی الدین انصاری کے فرزند اور قاضی صاحب کے ملازم خاص صوفی علی اکبر کملی والے کی تصنیف ہے، جو انہوں نے راولپنڈی میں بابو فتح محمد شاہ صاحب کی بیٹھک میں تصنیف کی۔ کتاب کا سنہ تالیف درج نہیں ہے۔ اندرونی شواہد سے معلوم ہوتا ہے کہ قاضی صاحب کی وفات کے بعد جلد ہی اس کے لکھنے کی نوبت آ گئی ہو گی۔

(۴)

صوفی علی اکبر کملی والا مرتب یادرفتگان قاضی سراج الدین احمد کے ابتدائی حالات کے بارے میں رقم طراز ہیں کہ قاضی سراج الدین ۱۸۶۶ یا ۱۸۶۷ عیسوی میں بھیرہ میں پیدا ہوئے۔ قاضی صاحب کی پیدائش کے بارے میں اپنی کتاب کی پشت پر اور اسی کاتب کے قلم سے ایک خاندانی یادداشت لکھی ہے۔ جس میں خاندان کے دوسرے افراد کے سنین پیدائش کے علاوہ خود قاضی صاحب کی پیدائش کا سنہ پوہ سمت ۱۹۲۲ بکرمی درج ہے۔

قاضی صاحب کا سلسلۂ نسب فاروق اعظم حضرت عمر بن الخطاب تک پہنچتا ہے، اسی نسبت سے قاضی

صاحب کی اولاد فاروقی کہلاتی ہے۔ ہندوستان میں ان کے جد اعلیٰ حضرت شیخ فرید الدین گنج شکر تھے۔ اجودھن (پاک پٹن) میں دفن ہوئے ان کے مفصل حالات منتخب التواریخ بدایونی اور دوسری کتابوں میں ملتے ہیں۔ شیخ فرید کی اولاد میں شیخ محمد طاہر ہوئے ہیں جن کے چھ فرزند تھے: شیخ طیب، شیخ عبدالرحمان، عبدالغفور، قاضی عبدالشکور، شیخ حبیب اور شیخ خواجہ۔ یہ افراد خاندان ایمن آباد میں اقامت گزیں ہوئے۔ یادرفتگان کی تالیف کے وقت شیخ طیب کی اولاد میں قاضی نظام الدین اور قاضی فضل حسین ایمن آباد ہی میں مقیم تھے۔ شیخ محمد طاہر کے فرزندوں میں قاضی عبدالشکور ایمن آباد سے بھیرہ میں اٹھ آئے اور ان کی اولاد کا سلسلہ بھیرہ ہی میں ہوگیا۔ قاضی عبدالشکور کے بیٹے قاضی عبدالصمد تھے۔ ان کے فرزند قاضی عبدالواحد، ان کے بیٹے محمد باقر تھے۔ محمد باقر کے فرزند مولوی عبدالغفور تھے۔ مولوی عبدالغفور کے چار لڑکے تھے: میاں ولی محمد، میاں حبیب اللہ، میاں شیخ احمد اور قاضی نور احمد، قاضی نور احمد کے چار بیٹے تھے: کرم الدین، فضل الدین، شرف دین اور شمس دین۔ ان میں کرم الدین قاضی سراج الدین کے والد تھے۔ گویا اس حساب سے اٹھارویں پشت پر ان کا شجرہ حضرت شیخ فرید الدین گنج شکر سے اور اڑتیسویں پشت پر حضرت عمر سے مل جاتا ہے (مزید تفصیلات شجرہ میں ملاحظہ فرمایئے) یادرفتگاں میں خاندان فاروقی کے حالات میں بھیرہ کی تفصیلات محمودی حملے (۱۰۰۱ء) اور شیر شاہ کی تعمیر کردہ مسجد کے ذکر کے بعد صوفی علی اکبر خاندان فاروقی کے بارے میں لکھتے ہیں:

> ''خاندان فاروقی ہمیشہ اسی شہر (بھیرہ) میں متولی کے خطاب سے ممتاز ہوتا چلا آیا ہے (کذا) قبلہ قاضی کرم الدین کا زمانہ امام یا متولی یا قاضی ءقضا کا دور تھا۔''

قاضی سراج الدین نے سیرۃ الفاروق (طبع ثانی) کے ٹائیٹل پیج پر اپنا نام یوں درج کیا ہے:

> ''جناب منشی سراج الدین احمد صاحب متولی سابق ایڈیٹر سرمور گزٹ حال مالک اخبار چودھویں صدی۔''

قاضی کرم الدین بھی متولی کہلاتے تھے۔ بھیرہ کے امام (مسجد) اور قاضی تھے۔ کرم الدین صاحب کے چار فرزند تھے۔ قاضی سراج الدین، حاجی احمد فضل احمد اور صدیق احمد۔ یہ سب صاحب اولاد ہوئے ہیں۔ حاجی احمد صاحب کے فرزند نذیر احمد اب تک حیات ہیں۔ یہ صاحب اعجاز احمد فاروقی کے رشتے کے ماموں ہیں۔

(۵)

قاضی صاحب کے ابتدائی حالات کے بارے میں زیادہ تفصیل نہیں ملتی۔ ''یادرفتگاں'' میں ان کی دایہ کا ذکر موجود ہے لیکن کاتب نے نام کی جگہ خالی چھوڑ رکھی ہے۔ والدہ اور دایہ کے زیر تربیت آپ کی

ابتدائی زندگی بسر ہوئی۔ گھر میں دینی تعلیم کا زور تھا اسی ماحول میں قاضی صاحب نے آنکھ کھولی۔ اگرچہ قاضی کرم الدین کے تین بچے تھے، لیکن ماں باپ کو سراج الدین ہی زیادہ عزیز تھے۔ ان کی والدہ نے ان کی تربیت میں خاص محنت کی۔ کچھ بڑے ہوئے تو والد نے پڑھانا شروع کیا۔ یہ سنہ ۱۸۷۲ء کی بات ہے۔

بسم اللہ کی رسم ہوئی، احباب جمع ہوئے، پہلا درس خود قاضی کرم الدین نے دیا۔ تربیت ہوتی رہی۔ دینی علم کے علاوہ دنیاوی تعلیم اینگلو ورنیکار نڈل سکول میں حاصل کی۔ سنہ ۱۸۸۱ء میں آٹھویں جماعت پاس کر لی، اس کے بعد تعلیم کا سلسلہ کچھ عرصہ کے لیے منقطع ہو گیا۔ ان کے سوانح نگار لکھتے ہیں:

> ''قاضی سراج الدین احمد کو جوانی کی آمد نے ولولوں اور جوشوں سے مجبور کر دیا کہ کہیں سیر کوئٹہ ہو، چنانچہ ممدوح سنہ ۸۱ء کے بعد کوئٹہ بلوچستان تشریف لے گئے اور وہاں محکمہ بارک ماسٹری میں ہمراہ مزدوران کام کروانے لگے، اڑھائی سا ل کا زمانۂ ملازمت کوئٹہ میں بسر ہوا ہو گا کہ شفقت پدری نے جوش مارا (اور) قاضی سراج الدین احمد صاحب بھیرہ آ گئے۔''

۱۸۸۴ء تک قاضی صاحب گھر ہی میں رہے۔ اس کے بعد میٹرک کی تعلیم کے لیے لاہور بھیجے گئے۔ سنہ ۱۸۸۶ء میں لاہور سے انٹرنس کا امتحان دیا اور پاس ہو گئے۔ ۱۸۸۶ء میں انہیں ریاست ناھن سرمور میں ملازمت مل گئی اور سپرنٹنڈنٹ پرنٹنگ آفس مقرر ہوئے۔ وہاں اخبار سرمور گزٹ آپ نے جاری کیا۔ پانچ سال تک آپ یہاں رہے۔ اسی ملازمت کے دوران میں مئی ۱۸۸۸ء میں آپ کی شادی اپنے حقیقی چچا کی لڑکی سے ہو گئی؛ ان کی بیگم کا نام صالحہ بی بی تھا۔

ریاست سرمور کا یہ قیام قاضی صاحب کی علمی سرگرمیوں کا آغاز کرتا ہے۔ غالباً اسی زمانے میں سرسید سے ان کے مراسم ہوئے ہوں گے۔ اپریل ۱۸۸۹ء کو لاہور آ کر قاضی صاحب نے مسلمانوں کی نماز پر لیکچر دیا، جس کے آخر میں انہوں نے سرسید احمد خاں کی حمایت کی اور اس افراد کی تردید کی جو یہ کہتے ہیں کہ سرسید قرآن کے دس پاروں کو مانتے ہیں اور باقی کو خارج کرنے کے قابل سمجھتے ہیں۔ اسی سال کے وسط میں سرسید احمد خاں کے انعامی مضمون یا سوال کے جواب میں انہوں نے تعلیم کے موضوع پر ایک طویل مقالہ لکھا اور سرسید کے پاس روانہ کیا۔ یہ مضمون ۱۸۹۱ء تک اسی طرح پڑا رہا اور اس کے بارے میں کچھ فیصلہ نہ ہوا۔ جب اس مضمون کو چھاپنے پر احباب نے اصرار کیا تو بعض حصے سرمور گزٹ میں شائع کیے گئے۔ ۲۰ جولائی ۱۸۹۱ء میں قاضی صاحب نے کچھ قطع و برید کے ساتھ ناھن سے اسے کتابی صورت میں شائع کر دیا۔ اس کے دیباچے میں لکھتے ہیں:

''جواب مضمون کو اس طرح پر چھاپ دینے کی وجہ بعض بزرگ اصحاب اور معزز

احباب کی تحریک اور تاکید ہوئی ہے اور اس کے بعض حصوں کے سرمور گزٹ میں طبع ہونے پر لائق اشخاص کی قدر دانی نے مجھ کو یقین دلایا کہ میں نے بے فائدہ محنت نہیں کی۔ جناب مولوی الطاف حسین صاحب حالی پانی پتی نے ایک دفعہ بیان فرمایا کہ ان سے کسی شخص نے مسئلہ میں دریافت کیا کہ بچوں کی تعلیم و تربیت کی نسبت جو شکایات ہیں وہ کیونکر رفع ہو سکتی ہیں تو انہوں نے جواب دیا کہ سرمور گزٹ میں جو سلسلہ مضامین تعلیم پر چھپتا ہے اس کو پڑھنا چاہیے۔ اس کے علاوہ جناب موصوف نے اور مولوی سید احمد صاحب دھلوی اور بہت سے معزز احباب نے مجھ کو لکھا کہ ان مضامین کو یک جا چھاپ کر شائع کرنا چاہیے حالانکہ وہ مضامین بالکل نامکمل اور غیر مربوط تھے اور ایک خاص زمانے میں دفع الوقتی کے واسطے چھاپ دیے تھے۔ میرے حالات نے مجھ کو صرف اس وقت اجازت دی کہ میں اس ارشاد کی تعمیل کروں اور کتاب کو اس نئی ترتیب سے چھاپوں اور اس جواب مضمون اور اس کتاب میں اتنا فرق ہے کہ اس کے دیباچہ میں طبی اسباب کی تاثیر کے مسئلہ پر بہت مفصل بحث کی گئی تھی اور آخر میں مسلمانوں کی مذہبی تعلیم کی بحث میں ایک باب تھا، یہ دونوں حصے اس کتاب میں سے بغرض انتصار خارج کر دیے گئے ہیں اور صرف تین باب یعنی دماغی، جسمانی اور اخلاقی تعلیم کے اس کتاب میں چھاپے گئے ہیں۔''

اس کتاب میں قاضی صاحب نے بچوں کی ابتدائی تعلیم کے بارے میں بنیادی مسائل سے بحث کی ہے اور جا بجا انگریز ادباء کے اقوال سے اسے مزین کیا ہے۔ کہیں کہیں مولانا حالی اور اردو فارسی کے بعض دوسرے مشاہیر کے اشعار بھی درج کیے ہیں، لیکن زیادہ استفادہ ہربرٹ سپنسر کی کتاب ایجوکیشن سے کیا ہے اور کتاب کے آغاز میں اس کا اقرار بھی کیا ہے۔ کتاب کا انتساب انہوں نے خلیفہ سید محمد حسن خان بہادر سی۔ آئی۔ ای دستور اعظم ریاست پٹیالہ کے نام سے کیا ہے۔ آغاز کتاب میں اس سلسلہ میں ان کا اجازت نامہ بھی درج کیا ہے جس پر ۱۲ دسمبر ۱۸۹۱ء کی تاریخ ہے۔ کتاب بڑی تقطیع کے ۱۲۷ صفحات پر مشتمل ہے۔ سرورق پر اپنا نام اور عہدہ اس طرح درج کیا ہے:

''خاکسار سراج الدین احمد ایڈیٹر سرمور گزٹ و سپرنٹنڈنٹ سٹیشنری اینڈ پرنٹنگ آفس ریاست سرمور ناھن۔''

کتاب کی اشاعت کے بعد مولانا حالی ۱۷ مئی ۱۸۹۲ء میں قاضی سراج الدین کے ہاں فروکش تھے اور مقدمہ شعر و شاعری کی تصنیف کے سلسلے میں قاضی صاحب سے مدد لی جا رہی تھی۔ ۴ جولائی اور ۳۰

اگست کے درمیان مولانا حالی ناھن سے لوٹے۔ اس سے بہت پہلے اور الماموں کی تالیف (۱۸۸۷ء) کے بعد ہی مولانا شبلی نعمانی نے الفاروق لکھنے کا ارادہ کیا تھا۔ مارچ ۱۸۸۹ء میں سرسید شبلی کے اس ارادے کے پیش نظر عماد الملک سے خط و کتابت بھی کر چکے تھے اور جنوری ۱۸۹۲ء میں سیرت النعمان کے دیباچے میں اپنی بعض مجبوریوں کا ذکر کیا تھا اور بتایا تھا کہ ''الماموں کے بعد ہی میں نے الفاروق لکھنی شروع کر دی تھی۔ اس کا معتد بہ حصہ لکھ بھی لیا تھا؛ لیکن بعض مجبوریوں سے چندروز کے لیے اس کی تالیف سے ہاتھ اٹھانا پڑا اس پر کوتاہ بینوں سے عجیب عجیب بدگمانیاں کیں حالانکہ بات اتنی تھی کہ بعض نادر کتابیں جو اس تصنیف کے لیے ضروری ہیں اور یورپ میں چھپ رہی ہیں ابھی تک پوری چھپ کر نہیں آ چکیں'' شبلی اس خیال کا اعادہ اپنے ایک خط مورخہ ۱۱ اپریل ۱۸۹۲ء میں بھی کرتے ہیں۔ سید سلیمان ندوی فرماتے ہیں:

> ''الفاروق کے نام میں کچھ ایسی جاذبیت تھی کہ لکھے جانے سے پہلے ہی ہندوستان کے اس سرے سے لے کر اُس سرے تک اس کا نام بچہ بچہ کی زبان پر تھا۔ یہ دیکھ کر بعض لوگوں کو خیال ہوا کہ مسلمانوں کی توجۂ نام سے فوری فائدہ کیوں نہ اٹھایا جائے۔ چنانچہ سرسید ہی کے حلقہ کے ایک صاحب منشی سراج الدین صاحب بیرسٹر راولپنڈی نے ۱۸۹۳ء میں سیرت الفاروق کے نام سے ایک کتاب لکھ کر بازار میں پیش کر دی۔ الفاروق کے مشتاقوں کا اس سے بڑی تکلیف پہنچی اور بعضوں نے اس کو منشی سراج الدین صاحب کی بدنیتی پر محمول کیا۔ اس موقع پر سرسید نے علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ مورخہ ۱۰ مارچ سنہ ۱۸۹۳ء میں لکھا ہے جس میں مولانا کی تعریف و توصیف اور منشی سراج الدین صاحب کی اس حرکت پر افسوس کے بعد الفاروق کی تجویز کی مخالفت میں اپنی رائے بھی بے پردہ ظاہر کر دی ہے۔''

ممکن ہے کہ نام کی شہرت سے کتاب لکھی گئی ہو لیکن اس کا ایک سبب اور بھی تھا۔ فاروق اعظم قاضی صاحب کے اسلاف میں سے تھے اور وہ ان کے کارناموں کو نمایاں کرنے کے خواہش مند تھے۔ یاد رہے سیرۃ الفاروق کا دیباچہ ۱۰ دسمبر ۱۸۹۲ء کو لکھا گیا۔ اس زمانے میں قاضی صاحب ناھن میں تھے بیرسٹر راولپنڈی نہ تھے۔ سیرۃ الفاروق کے دیباچے میں مولانا شبلی کے بارے میں لکھا ہے:

> ''مجھ کو دیباچہ کے آخر میں اپنے استعداد اور مقدور سے بڑھ کر ایک ایسا بزرگ کام، جیسا کہ حضرت عمر کے حالات لکھنا ہے، اختیار کرنے کی نسبت چند الفاظ کہنے ہوں گے۔ اصل یہ ہے کہ میں کوئی خواہش اور ارادہ نہیں کیا اور کسی طرح ایسا

ارادہ کرنا واجب نہیں تھا، جبکہ ہمارے اس زمانہ کے اسلامی مورخ مولوی محمد شبلی صاحب نعمانی اس کے کرنے کا وعدہ اور اعلان کر چکے تھے، مگر بعض واقعات نے مجھے اس کام کی طرف کھینچا۔ کئی برس سے ایک قلمی مسودہ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے حالات پر ترتیب دینے اور شائع کرنے کے واسطے فرمائشاً میرے پاس تھا۔ اس کی صحت کے خیال نے مجھے اس مضمون پر زیادہ پڑھنے کی طرف مائل کیا اور اس وقت وہ مسودہ مجھ کو صرف حضرت عمرؓ کے بزرگ اور عظیم الشان حالات کے روبروئے کار معلوم ہوا اور ان کے دلچسپ حالات اور اس عظیم نفع کے خیال سے جو ہر ایک مسلمان ایک بادشاہ سے لے کر عامی تک حضرت عمر کے حالات کے مطالعہ سے حاصل کر سکتا ہے، میں اپنے چند روزہ مطالعہ کے نتیجے کو جمع کرنے اور شائع کرنے کی طرف مائل ہوا، کیونکہ میں یقین کرتا ہوں کہ ہماری اردو زبان میں جب کہ چھ کروڑ مسلمان ہندوستان میں بولتے ہیں، ایک مضمون پر ایک سے زیادہ کتابیں موجود ہونے میں کوئی نقصان نہیں ہے۔

لیکن میری کتاب سے یہ امید کرنا غلطی ہوگی کہ جناب مولوی محمد شبلی کی کتاب الفاروق کی ضرورت کو اس سے رفع کر دیا ہو۔ یہ کتاب زیادہ تر سہل الحصول ماخذوں سے تالیف کی گئی ہے اور عالمانہ تحقیقات اور تدقیقات کی طرف مولوی صاحب کے علم و فضل سے ہی توقع کی جا سکتی ہے اور مجھ کو امید ہے کہ یہ کتاب بوجہ ان اعلیٰ امیدوں کے جو مولوی صاحب کی کتاب سے ہیں اس کے اشتیاق کو زیادہ کرنے کا باعث ہوگی۔

اگرچہ میں نے یہ بات کہی ہے کہ میری کتاب سہل الحصول ماخذوں سے تالیف کی گئی ہے لیکن بایں ہمہ میں نے ضعیف روایات اور غیر معتبر تاریخوں کی وہی وقعت دی ہے۔ جس کی کہ وہ لائق تھیں اور میں نے ان کی طرف مطلق کچھ التفات نہیں کیا۔''

اس کی اشاعت پر مولانا شبلی نے برا مانا اور کتاب کی تالیف میں غالباً سر سید کا اشارہ بھی سمجھا گیا ہوگا چنانچہ سر سید کو ۱۰ مارچ ۱۸۹۳ء کے علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ میں لکھنے کی ضرورت محسوس ہوئی۔ وہ نہیں چاہتے تھے کہ شبلی اس موضوع پر کتاب لکھیں۔ اس موضوع پر شیعہ سنی اختلاف کا موقع نکل سکتا تھا اور اسے وہ علی گڑھ کالج اور اپنی تحریک کے منافی سمجھتے تھے۔ چنانچہ وہ اس تحریر میں بھی دبے لفظوں میں شبلی کو الفاروق لکھنے سے روکتے ہیں اور ساتھ ہی ساتھ منشی سراج الدین کے بارے میں فرماتے ہیں:

''حضرت عمرؓ کی لائف لکھنا ایسا آسان کام نہیں تھا جیسا کہ ہمارے دوست منشی سراج الدین احمد صاحب نے سمجھا۔ مگر ہم کو افسوس ہوتا ہے جب ان کی نسبت کوئی الزام بدنیتی کا دیا جاتا ہے۔ منشی سراج الدین احمد صاحب ایک نیک آدمی ہیں، قومی بھلائی کا وہ خیال ظاہر کرتے ہیں۔ بے شک ہم کہہ سکتے ہیں انہوں نے غلطی کی؛ جو کام ان کو نہ کرنا چاہیے تھا انہوں نے کیا، وہ کام ان کے قابو سے باہر تھا بلکہ ہم تو سمجھتے ہیں کہ ہمارے مخدوم وحید العصر مولوی شبلی کے قابو سے بھی باہر تھا، مگر کسی بدنیتی یا طمع نفسانی کا الزام جو لوگ منشی سراج الدین احمد کی نسبت لگاتے ہیں نہ ہم اس کو پسند کرتے ہیں اور نہ درست سمجھتے ہیں، فرض کرو کہ ایک مضمون پر ایک شخص نے کتاب لکھنے کا ارادہ کیا، اسی مضمون پر دوسرے شخص نے بھی کتاب لکھی، اس میں نقصان کیا ہوا۔ بلکہ دونوں کتابیں موجود ہوں گی تو لوگوں کو دونوں میں تمیز کرنے کا عمدہ موقع ملے گا اور یہ صادق آوے گا فتقبل من احدھما ولم یتقبل من الاخر۔ یہ سمجھنا کہ منشی سراج الدین احمد کے سیرۃ الفاروق تحریر کرنے سے مولوی شبلی بے دل ہو گئے ہیں، اب وہ ہیروز آف سلام لکھیں گے اور نہ الفاروق، محض غلط خیال ہے۔ اگر اہل ملک مولوی شبلی کی تصانیف کو سمجھتے ہیں تو وہ یقین کریں گے کہ اگر ایک ہی مضمون پر دس شخص بھی لکھیں تو مولوی شبلی کی تحریر نرالی ہوگی، پس ان کا کیا پرواہ ہے کہ اور کسی نے بھی کچھ لکھا ہے۔''

مولانا شبلی نے ۱۸ اگست ۱۸۹۴ء کو کتاب لکھنے کا قطعی فیصلہ کر لیا اور کتاب کی تکمیل ۵ جولائی ۱۸۹۸ء کو ہوگئی۔ سرسید ۲۷ مارچ ۱۸۹۸ء کو وفات پا چکے تھے۔ کتاب کی اشاعت کی نوبت اس کے بعد آئی ہے۔ وہ زندہ ہوتے تو معلوم نہیں ان کی رائے کیا ہوتی؛ لیکن الفاروق اور سیرۃ الفاروق کے مقابلے سے معلوم ہوتا ہے کہ شبلی کی کتاب تحقیقی اعتبار سے منشی سراج الدین کی کتاب سے کہیں بلند ہے۔ شبلی نے ثابت کر دیا کہ الفاروق کی تصنیف ان کے قابو کی چیز ہے اور منشی سراج الدین کی تالیف بالکل معمولی اور دوسرے درجے کے مصادر پر مبنی ہے جسے پانچ چھ ماہ کی قلیل مدت میں اسے مکمل کیا گیا تھا۔

منشی سراج الدین کی کتاب سیرۃ الفاروق بڑی تقطیع کے ۲۳۶ صفحات پر مشتمل ہے اور اس کے ایک سے زیادہ ایڈیشن نکل چکے ہیں۔ میرے پیش نظر بعد کا کوئی ایڈیشن ہے جو مصطفائی پریس لاہور سے شائع ہوا اور اس کے ناشر منشی محمد فضل الدین صاحب ککے زئی تاجر کتب قومی مالک اخبار اشاعت بازار کشمیری لاہور ہیں۔ کتاب کی قیمت ڈیڑھ روپیہ رکھی گئی۔ کم وبیش اسی زمانے میں نواب حاجی محمد اسماعیل

خان دتاولی کے کہنے پر منشی سراج الدین صاحب نے سرسید کی سوانح عمری لکھنے کا کام بھی شروع کیا؛ بلکہ ۱۸۹۲ء تک یہ کتاب مکمل بھی کر لی۔ اسے سرسید کی زندگی میں شائع کرنے کی تجویز بھی ہوئی؛ بشرطیکہ سر سید خود مسودہ دیکھ لیں اور اس کی تصحیح کر دیں لیکن سرسید نے ایسا کرنے سے انکار کر دیا؛ اس لیے سرسید کی زندگی میں اسے شائع کرنے کا خیال ترک کرنا پڑا اور اس کو مسودہ نواب حاجی اسماعیل خان کے پاس پڑا رہا۔ سرسید کی وفات کے تھوڑے ہی عرصے بعد منشی سراج الدین انگلستان چلے گئے۔ یہ مسودہ مولانا حالی کے سپرد کیا گیا۔ حالی نے اس کو دوبارہ لکھا اور اپنے انداز کے مطابق عنوانات کو مرتب کیا۔ منشی سراج الدین کا یہ بیان ان کی اردو کتاب ''حقیقت خلافت اور مسلمانوں کا فرض'' کے دیباچے میں بھی پایا جاتا ہے۔ لکھتے ہیں:

> ''سرسید کی سوانح عمری نواب حاجی محمد اسماعیل خان صاحب کے ارشاد سے اردو زبان میں سب سے پہلے مؤلف رسالہ ہذا نے جمع کی تھی، جس کو مولانا خواجہ حالی مرحوم نے نہایت وسعت اور قابلیت کے ساتھ جو صرف انہی سے مخصوص تھی، ترتیب دے کر ''حیات جاوید'' کے نام سے چھپوایا۔''

حالی نے حیات جاوید لکھنے کا ارادہ علی گڑھ کالج کے قیام کے فوراً بعد کر لیا تھا۔ پھر ۲۹ ستمبر میں اس کا ذکر کیا ہے۔ سرسید کی وفات کے بعد یہ ارادہ پختہ ہو گیا، چنانچہ ۱۰ مارچ ۱۸۹۹ء کے ایک خط میں اس کے بہت سے حصے لکھے جانے کا تذکرہ حالی نے خود کیا ہے۔ ۲۲ اگست ۱۸۹۸ء تک کتاب نامکمل تھی اور صرف چھ سو صفحے چھپے تھے، ۷ مارچ ۱۹۰۱ء کو انڈکس بھی پریس میں چلا گیا تھا، ۱۶ اپریل ۱۹۰۱ء تک کتاب چھپ کر مارکیٹ میں آ چکی تھی۔

حیات جاوید کی اولیں اشاعت کے دیباچے میں، جو طبع اکادمی پنجاب میں بھی شامل ہے، قاضی سراج الدین کے مسودے کا ذکر ہے۔ مولانا حالی لکھتے ہیں:

> ''کچھ دنوں کے بعد سرسید کے نہایت خالص و مخلص دوست آنریبل حاجی اسماعیل خان رئیس دتاولی کو یہ خیال پیدا ہوا کہ یہ معزز لائف، جہاں تک جلد ممکن ہو، اردو زبان میں مکمل طور پر لکھی جاوے؛ چنانچہ ان کی تحریک سے میرے دوست منشی سراج الدین احمد، مالک و مہتمم چودھویں صدی، سرسید کی لائف لکھنے پر آمادہ ہوئے۔ انہوں نے بڑی کوشش سے اس کے لیے میٹیریل جمع کیا اور ایک خاص حد تک اس کو ترتیب دے کر حاجی صاحب کو دے دیا۔ کئی برس تک وہ مسودہ رکھا رہا مگر اس کے چھپنے کی نوبت نہ آئی۔ ۔۔ چونکہ کرنل گریہم اور منشی سراج الدین سرسید کی زندگی میں ان کی لائف لکھنے کی راہ نکال چکے تھے، میرے

دل میں پھر ایک ولولہ اٹھا۔۔۔ان خیالات سے میں نے مصمم ارادہ کرلیا کہ سب کام چھوڑ کر پہلے اس قومی فرض کو ادا کرنا چاہیے؛ چنانچہ ۱۸۹۴ء میں اس غرض سے میں نے چند ماہ علی گڑھ میں قیام کیا۔۔۔ میں آنریبل حاجی اسمٰعیل خاں کا شکر گزار ہوں کہ جس وقت ان کو میرا یہ ارادہ معلوم ہوا انہوں نے وہ تمام مسودات، جو منشی سراج الدین نے مرتب کیے تھے، میرے حوالے کر دیے اور اپنے دوست منشی سراج الدین کا بھی ممنون ہوں کہ ان کے مسودات سے میں نے فائدہ اٹھایا۔"

حالی کے خلوص سے یہ امکان نہیں کہ انہوں نے اس سلسلے میں کسی بد دیانتی سے کام لیا ہو۔ انہوں نے منشی صاحب کے مسودے سے استفادے کا اقرار کرلیا ہے اور ایک چھوڑ دو جگہ دیباچے میں اس کا تذکرہ کیا ہے۔ مسودے کی غیر موجودگی میں یہ کہنا مشکل ہے کہ حالی نے ان کی کتاب سے کس حد تک مزید استفادہ کیا۔ حیات جاوید سے اتنا ضرور معلوم ہوتا ہے کہ حالی منشی سراج الدین صاحب کے مسودے کو ناقص اور کسی حد تک غیر مکمل اور بے ترتیب سمجھتے تھے اور کتاب کی تکمیل انہوں نے دوسرے ذرائع سے بھی کی ہے۔

حیات جاوید کی تکمیل کے بعد ۱۷ جون ۱۹۰۱ء کے ایک مکتوب میں مولانا حالی حبیب الرحمان خاں شروانی کو لکھتے ہیں:

حاجی محمد اسمٰعیل خاں صاحب نے سر سید کی زندگی میں وعدہ کیا تھا کہ پانسو روپے کی کتابیں (حیات جاوید) خرید کر کالج کو دوں گا؛ مگر میں سر سید کو اپنے تئیں خوش قسمت سمجھوں گا جب یہ سنوں گا کہ انہوں نے کوئی کاپی ڈیوٹی (شاپ) سے خرید فرمائی ہے اور اس کو مطالعہ کے قابل سمجھا ہے۔

یہ کہنا مشکل ہے کہ حاجی نواب اسمٰعیل نے یہ روش کیوں اختیار کی۔ حیات جاوید کے دیباچے کے اقتباس اور اس مکتوب کے الفاظ سے اتنا ضرور معلوم ہوتا ہے کہ حاجی صاحب نے سر سید کی زندگی ہی میں حالی سے حیات جاوید کے سلسلے میں وعدہ کیا تھا اور یہ کہ جب حالی کے ارادے کا علم ہوا تھا تو انہوں نے قاضی سراج الدین کا مسودہ حالی کے حوالے کر دیا تھا۔ اس طرح گویا یہ مسودہ حالی کے پاس سر سید کی زندگی ہی میں پہنچ گیا تھا۔ قاضی صاحب نے جو یہ کہا ہے کہ سر سید کی وفات کے بعد مسودہ حالی کے سپرد ہوا اس میں غالباً انہیں تسامح ہوا ہے۔

(۶)

قاضی سراج الدین ۱۰ دسمبر ۱۸۹۲ء تک ناھن ہی میں مقیم تھے؛ لیکن ۱۸۹۳ء میں انہیں ریاست پونچھ

میں ملازمت مل گئی، وہ بقول مصنف یادرفتگاں ''چیف جج'' مقرر ہو کر وہاں تشریف لے گئے۔ تین برس قاضی صاحب کا وہاں قیام رہا۔ ان کے اس زمانے کی کوئی تصنیف ہاتھ نہیں لگی۔ گمان غالب یہ ہے کہ قاضی صاحب الفاروق والے ہنگامے سے دل برداشتہ ہو گئے تھے اور تصنیف و تالیف کا سلسلہ منقطع ہی رہا۔ اس زمانے میں قاضی صاحب نے ریاست پونچھ میں شادی بھی کر لی۔ ان کے سوانح نگار رقمطراز ہیں:

ریاست پونچھ سے ایک ڈولہ شادی بھی جناب کو مرحمت ہوا (یادرفتگاں ص ۱۶) ریاست پونچھ سے جناب کو ایک ڈولہ بھی عطا ہوا اس دوسری بیگم، فاطمہ بیگم صاحبہ، کا شہرۂ سخاوت راولپنڈی بھر میں مشہور ہو گیا؛ یہاں تک کہ بھیرہ اور تمام برادری میں سخاوت کا چرچا گھر گھر پہنچا۔ اس شادی کی خبر سن کر بیگم صالحہ بی بی صاحبہ نے ہنس کر فرمایا ''ہزار شکر میرا آقا مرا سرتاج زمانہ بھر کی کریمہ کا نکاح کر کے لایا ہے''۔۔۔ جنابہ بی فاطمہ بیگم صاحبہ ۱۹۰۸ء میں داغ مفارقت دے کر جنت کو چل بسیں۔

اس بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ قاضی صاحب کی یہ شادی ان کی پہلی بیگم کی غیر موجودگی میں ہوئی؛ ممکن ہے بیگم صاحبہ اس وقت بھیرہ میں آئی ہوئی ہوں اور شادی کی خبر انہوں نے وہیں سنی ہو۔ ۱۸۹۶ء میں منشی سراج الدین ریاست پونچھ سے واپس آ گئے اور راولپنڈی میں سکونت اختیار کی۔

راولپنڈی آ کر انہوں نے اخبار ''چودھویں صدی'' کا اجراء کیا۔ انجمن اسلامیہ راولپنڈی کا آغاز کیا اور اسلامیہ ہائی سکول راولپنڈی کی بنیاد رکھی۔ ساتھ ہی ساتھ تصنیف و تالیف کا سلسلہ جاری رکھا۔ اخبار چودھویں صدی کے پرچے باوجود تلاش کے نہیں مل سکے۔ اس کے مضامین کے بارے میں کچھ نہیں کہا جا سکتا، البتہ اس زمانے کی ایک تالیف ''حیات صلاح الدین'' ہے جو یکم جون ۱۳۱۸ھ/۱۹۰۰ء کو شائع ہوئی۔ یہ بڑی تقطیع کے ۲۴۴ صفحات (بشمول دیباچہ) پر مشتمل ہے۔ اسے منشی محمد بلال کرم بخش مالکان مطبع و کتب خانہ بلالی ساڈھورہ نے اپنے مطبع بلالی ساڈھورہ ضلع انبالہ سے طبع کیا۔ اس اشاعت کی قیمت دو روپے فی جلد رکھی گئی۔ پہلا ایڈیشن کہاں سے شائع ہوا، اس کا علم نہیں؛ لیکن یہ گمان ہے اسی ناشر کی طرف سے شائع ہوا ہو۔ ٹائیٹل پیج پر ان کا نام ''مولوی سراج الدین احمد صاحب ایڈیٹر چودھویں صدی راولپنڈی'' درج ہے۔ یہ کتاب تاریخ کی ہے اور اس کے ماخذوں کے بارے میں خود قاضی صاحب دیباچے میں فرماتے ہے:

> ''میری اس کتاب کا ماخذ کروسیڈ کے مشرقی اور مغربی مورخ ہیں۔ جہاں ان میں سے ایک فریق کو بھی آپس میں اتفاق بہت کم ہوتا ہے وہاں دونوں کو باہم متفق کرنا اور بھی زیادہ مشکل ہے اور صرف کثرت روایات پر یا قرائن و احتمالات سے ہی فیصلہ کیا جا سکتا ہے ہماری زبان میں کروسیڈ یعنی صلیبی لڑائیوں

کے سب سے بڑے نامور ہیرو یعنی سلطان صلاح الدین کی نسبت اس قدر کتابیں موجود ہیں کہ کسی اور کے حالات میں بہت کم ہوں گی۔ صلاح الدین کا زمانہ ادب اور تاریخ اور مسلمانوں کی ترقیات کے اعتبار سے بجائے خود ایک بے نظیر اور سب سے نامور اور مشہور مورخوں کا اپنا زمانہ ہے۔ یورپین زبانوں میں فرانسیسی مورخ مچاڈ کی تاریخ کروسیڈ سے بہتر کوئی کتاب مشکل سے لکھی گئی ہوگی۔ مسلمان مورخوں کی سادگی اور صداقت ان کا ایک ممتاز اور مؤثر کیریکٹر اور ان میں اور عیسائی مؤرخین میں جو فرق ہے وہ بھی اس کتاب کے صفحوں سے معلوم ہوگا۔''

راولپنڈی میں تین برس گزارنے کے بعد قاضی سراج الدین ۱۸۹۸ء ہی میں انگلستان روانہ ہوئے۔ تین سال انگلستان میں قیام کیا اور ۱۹۰۱ء میں بیرسٹری کی ڈگری لے کر واپس لوٹے اور راولپنڈی میں پریکٹس شروع کی۔ اس زمانے میں قاضی صاحب راولپنڈی کی سوشل اور تعلیمی زندگی میں بڑی سرگرمی سے حصہ لیتے رہے۔ اسلامیہ ہائی سکول (مری روڈ) کی عمارت اور ہوسٹل وغیرہ کی تعمیر بھی قاضی صاحب کی کوششوں کا نتیجہ تھی۔ پریکٹس بھی چل رہی تھی اور ادبی کام بھی ہو رہا تھا۔ چودھویں صدی پریس بھی قائم کیا۔

''یہ پریس پرانے قلعہ میں واقع تھا یعنی پنڈی کی جامع مسجد کے سامنے نیچے کی منزل میں پریس تھا، اوپر کی منزل میں مکان تھا جو قاضی صاحب نے کرائے پر دے رکھا تھا۔ ان کا اپنا قیام ڈی۔ اے وی کالج روڈ پر تھا نمبر شاید ج ۳۳۹ تھا۔''

اس پریس کے مصحح اور مہتمم حکیم محمد حسین طیب احمد آبادی تھے۔ حکیم صاحب شاعر بھی تھے اور پریس کے کام کے ساتھ ساتھ مطب بھی کرتے تھے۔ قاضی صاحب کی کتابوں کے آخر میں حکیم صاحب کی دواؤں کے اشتہارات بھی درج ہیں جو چودھویں صدی پریس ہی میں فروخت کی جاتی تھیں۔ شفاخانے کا پتا تھا'' بقائے نسل انسان چودھویں صدی پریس راولپنڈی''۔ پریس کی منیجر کی معرفت کتابوں کی فروخت کا انتظام بھی تھا۔

قاضی صاحب کی دیگر مصروفیات کی وجہ سے اخبار چودھویں صدی جاری نہ رہ سکا۔ کچھ عرصہ بند رہا پھر ماہوار رسالے کی صورت میں شائع ہونے کا اعلان ہوا (سنہ کا تعین مشکل ہے)۔ سلسلہء داستان پاستان کی پہلی جلد کے حصہء اول کے آخر میں رسالے کے بارے میں مندرجہ ذیل اشتہار درج ہے:
جب یہ باور کر لیا گیا تھا کہ چودھویں صدی اپنے اغراض وفرائض کو پورا کر چکا ہے اور اس کی ایسی

ضرورت نہیں رہی جیسی کہ اسکے اجراء کے وقت تھی، تو اس کو بند کر دیا گیا تھا لیکن ملک کی موجود حالت کے لحاظ سے؛ جس میں ایک طوفان بے تمیزی پیدا کیا جا رہا ہے اور چند دیوانہ اور بداندیش جماعتوں کے ہاتھ سے حکومت اور رعایا دونوں معرض خطر میں دکھائی دیتے ہیں، پھر ضروری سمجھا گیا ہے کہ چودھویں صدی کو جاری کیا جائے۔ اس کے مالک واڈیٹر (قاضی سراج الدین احمد بیرسٹرایٹ لا) کی مصروفیات کی وجہ سے چودھویں صدی کو اعلیٰ درجہ کے اہتمام کے ساتھ چھاپنا صرف ایک ماہواری رسالہ کی شکل میں ہوسکتا ہے؛ پس آئندہ اس کو ماہواری رسالہ کی شکل میں چھاپا جائے گا۔ رسالہ کی حیثیت ایسی بنائی جائے گی کہ اس کی آواز مسلمانان ہندوستان کی صدا سمجھی جائے۔ اس میں ہر ایک قسم کے تاریخی، علمی، اخلاقی، تجارتی اور اصلاحی مضامین درج ہوں گے اور کوئی ایسا امر، مضمون، اطلاع یا خبر، جو ہندوستان کے مسلمانوں کی دلچسپی یا نفع کا باعث ہو، ترک نہیں کی جائیگی۔ اس رسالہ کو مسلمانوں کی ان تمام عملی کارروائیوں کا، جو ان کو ملکی تجارتی یا اصلاحی امور کے متعلق کرنی چاہیں، ایک ذریعہ اور آلہ بنایا جائے گا اور بہت تھوڑے عرصہ میں یہ امر ثابت کر کے دکھا دیا جائے گا کہ اس رسالہ کی مسلمانان ہندوستان کو کس قدر ضرورت تھی۔

ایک خصوصیت رسالہ چودھویں صدی میں یہ ہوگی کہ کوئی مضمون جو کسی اردو انگریزی یا عربی اخبارات اور رسالہ میں ایسا چھپے گا، جو مسلمانوں کے پڑھنے کے واسطے دلچسپ یا مفید ہوگا، وہ بلحاظ ازدیاد ضخامت رسالہ اس میں چھاپ دیا جائے گا۔

رسالہ کی ضخامت پچاس صفحہ تک کی ہوگی۔ عمدہ کاغذ پر بہت اہتمام سے چھاپا جائے گا اور چندہ سالانہ پانچ روپے ہوگا۔ طالب علموں سے چار روپے منظور کر لیے جائیں گے۔ درخواستیں جلد آنی چاہیں کہ رسالہ فوراً جاری کر دیا جائے۔ اس رسالہ کے واسطے ایک سب اڈیٹر کی ضرورت ہے۔ جس کو تنخواہ دی جائے گی اور قابل مضمون نگاروں کی جن کو معاوضہ دیا جائے گا۔

المشتہر

منیجر چودھویں صدی راولپنڈی

اس سے رسالے کی نوعیت کو کچھ اندازہ ہوسکتا ہے۔

قاضی صاحب نے اس زمانے میں ناول نگاری شروع کر دی اور چودھویں صدی پریس کے اہتمام سے اسلامی تاریخی ناولوں کے ایک سلسلے کا "داستان پاستان" کے نام سے آغاز کیا۔ اس کا اشتہار، جو ان کتابوں کی پشت پر چھاپا گیا، خاصا ہنگامہ خیز تھا۔ اس کے بعض فقرے یہ ہیں:

(۱) اردو ناول نویسی میں انقلاب

(۲) اگر کوئی شخص یہ ثابت کر دے کہ اردو زبان میں اس پایہ کی کوئی ناول اس سے پہلے لکھی گئی ہے تو ہم کتاب کو واپس قیمت طلب منظور کر لینے سے قیمت واپس کر دیں گے۔

(۳) اس سلسلے کی پہلی جلد کے شروع میں ایک دیباچہ بھی درج ہے جس میں یہ بیان کیا گیا ہے کہ ناولوں کے لکھے جانے کی غرض کیا ہے اور ناول کی خوبیاں اور عیوب کیا ہوتے ہیں اور یہ بھی دکھایا گیا ہے کہ جن ناولوں کو اردو زبان میں اعلیٰ درجہ کی ناولیں قرار دیا گیا ہے ان میں کیا کیا عیب اور نقص موجود ہیں۔

لیکن جس دیباچے کا یہاں انہوں نے ذکر کیا ہے وہ ان کے پہلے ناول کے شروع میں نہیں ہے۔ معلوم ہوتا ہے بعد کی اشاعتوں میں اسے خارج کر دیا گیا۔ بہر حال قاضی سراج الدین احمد بیرسٹرایٹ لا ایڈیٹر چودھویں صدی راولپنڈی کے ناولوں کا آغاز دھوم دھام سے ہوا۔ تاریخی ناولوں کے اس سلسلے کی دو شاخیں قرار دی گئیں؛ ایک Original تاریخی ناولوں کا سلسلہ جس میں تین جلدیں ہیں۔ پہلی دو جلدیں اسپین کی ابتدائی اسلامی تاریخ سے متعلق ہیں۔ تیسری جلد میں سپین کے فاتح ثانی عبدالرحمان الداخل کو ہیرو بنایا گیا ہے۔ دوسرا سلسلہ تراجم کا ہے، اس میں صرف ایک ناول شائع کی گئی "حجاج بن یوسف"، جو عربی سے ترجمہ کی گئی۔ پروگرام تھا کہ اس دوسرے سلسلے میں انگریزی اور عربی سے اچھی ناولیں ترجمہ کی گئی۔ پروگرام تھا کہ اس دوسرے سلسلے میں انگریزی اور عربی سے اچھی ناولیں ترجمہ کی جائیں گی؛ لیکن یہ سلسلہ اس کے بعد نہیں چل سکا۔ سلسلہء اول کی پہلی جلد فاتح ہسپانیہ کے عنوان سے چھاپی گئی۔ جو مطبوعہ نسخہ ملا ہے اس کے سرورق اور ابتدائی صفحات ۱ تا ۶، و ۲۵ تا ۲۸ مطبع چودھویں صدی راولپنڈی میں اور باقی حمیدیہ سٹیم پریس لاہور میں طبع ہوئے۔ کتاب کی قیمت ایک روپیہ چار آنے رکھی گئی (تعداد صفحات ۲۵۶)۔ اس جلد کا انتساب مولوی رحیم بخش صاحب پریذیڈنٹ کونسل ریجنسی بہاولپور کے نام کیا گیا اس کی وجہ یہ دی ہے کہ "یہ ان کی دلالت الی الخیر کا نتیجہ تھا کہ جناب نواب علیا جدہ محترمہ و معظمہ نواب بہادر بہاول پور نے پچاس ہزار روپیہ کا عطیہ ندوۃ العلماء کو بخشنے سے ایک بے نظیر فیاضی اور عظیم الشان حمایت قومی فرمائی ہے" ندوۃ العلماء کے لیے یہ عطیہ تعمیر عمارت کے سلسلے میں تھا جس کی روداد مولانا سلیمان ندوی نے حیات شبلی میں درج کی ہے۔ یہ واقعہ ۱۹۰۷ء کا ہے؛ گویا ناول پہلی بار اس زمانے میں شائع کی گئی۔ دوسری جلد فاتح ہسپانیہ حصہ دوم کے نام سے چودھویں صدر پریس میں شائع ہوئی۔ اس کی قیمت ڈیڑھ روپیہ فی جلد تھی (تعداد صفحات ۲۸۵) اس کا انتساب بھی مولوی رحیم بخش صاحب کے نام ہے اور لکھا ہے:

"ابھی حصہء اول شائع نہیں ہوا تھا کہ بہاول پور کی طرف سے یہ تازہ تازہ مژدہ

جانفزا آیا کہ اس پر خیر و برکت اسلامی ریاست کی ایک جدید عظیم الشان فیاضی نے انجمن حمایت اسلام کو پچاس ہزار روپیہ ریاست سے اور پچیس ہزار روپیہ رعایا سے دلانے اور دو ہزار چھ سو روپیہ سالانہ کی امداد مقرر کرنے سے اسلامیہ کالج لاہور کی بیخ و بنیاد کو مضبوط اور استوار کر دیا ہے۔''

اس کے کچھ بعد اس سلسلے کی تیسری جلد آئی جو فاتح ثانی ہسپانیہ کے عنوان سے شائع کی گئی۔ اس کا جو نسخہ زیر نظر ہے وہ مطبع چودھویں صدی راولپنڈی کا ہے اور اس کی قیمت ۱۲ آنے فی جلد قرار دی گئی ہے۔ کتاب کے آخر میں مصحح مطبع کی طرف سے ایک قطعہ تاریخ بھی درج ہے جس سے ۱۳۲۷ء برآمد ہوتا ہے (تعداد صفحات ۲۹۲)۔

دوسرے سلسلے کی کتاب ''حجاج بن یوسف'' عربی زبان سے ترجمہ کر کے شائع کی گئی۔ یہ بھی قاضی صاحب نے اپنے مطبع سے شائع کی۔ ایک ہزار چھپی اور ہر نسخے کی قیمت سوا روپیہ قرار پائی (تعداد صفحات ۲۴۸)۔ اس پر قاضی صاحب کا نام درج نہیں ہے بلکہ دیباچے میں لکھا ہے کہ ایک عربی دان فاضل سے ترجمہ کرائی گئی۔ یہ دیباچہ مالک مطبع کی طرف سے ہے۔ اگرچہ انداز نگارش قاضی صاحب کے طرز کی غمازی کرتا ہے لیکن اسے قاضی صاحب کی تصنیف شمار کرنا شبہے سے خالی نہیں۔ دوسری جلد کی اشاعت کے وقت قیمتوں پر نظر ثانی کی گئی اور طے پایا کہ ہر سو صفحہ کتاب کی قیمت آٹھ آنہ لی جائے، ساتھ ہی یہ اعلان بھی کیا گیا کہ اشاعت زیادہ ہونے پر قیمت کم کر دی جائے گی۔ کتب کی مختلف اشاعتوں سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ یہ سلسلے خاصے مقبول ہوئے اور غالباً ہر ناول کے ایک سے زیادہ بار چھپنے کی نوبت آئی۔ سلسلہ اول کی تیسری جلد کے دو نسخے پیش نظر ہیں۔ یہ جلد پہلی بار چودھویں صدی پریس سے اور دوسری بار لکشمی آرٹ سٹیم پریس راولپنڈی سے شائع ہوئی۔ دوسری اشاعت پر قاضی صاحب کے نام کے شروع میں خان بہادر کا خطاب بھی ہے جو جنگ عظیم کے موقع پر انہیں سرکار کی طرف سے ملا تھا۔

قاضی صاحب کی زندگی کے اس مرحلے میں دو اہم واقعات ہوئے: ایک تو ان کی چھوٹی بیگم فاطمہ بیگم ۱۹۰۸ء میں وفات پا گئیں، ان سے قاضی صاحب کی کوئی اولاد نہیں ہوئی، دوسرے اسی سال قاضی صاحب نے تیسری شادی منشی عطا محمد اور تاج محمد میر منشیوں کے خاندان میں کر لی، یہ پٹھان تھے۔ نئی بیگم کا نام زینت جان تھا۔ یاد رفتگان کے مصنف قاضی صاحب کی دونوں بیویوں کے درمیان اچھے تعلقات کے موید ہیں لیکن یہ بیانات درست نہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ بڑی بیگم بھیرہ میں سکونت پذیر ہو گئیں اور نئی بیگم راولپنڈی میں فروکش ہوئیں۔ اس زمانے میں قاضی صاحب کی توجہ تصنیف و تالیف سے زیادہ پریکٹس اور سوشل کاموں میں صرف ہونے لگی۔ اپنی زندگی میں قاضی صاحب نے کافی جائیداد

پیدا کی۔ اُن کا آبائی مکان تو بھیرہ میں پہلے ہی تھا، راولپنڈی کے قیام کے دوران میں پنڈی سے تین میل کے فاصلے پر کھنہ کا علاقہ خریدا۔ یہ خاصا بڑا علاقہ ہے جس میں چھوٹے چھوٹے پچیس کے قریب گاؤں آباد تھے مجموعی طور پر آباد علاقہ کم اور غیر آباد زیادہ تھا۔ اب تک یہ علاقہ قاضی صاحب کے چشمے یا قاضی کی جھیل کہلاتا ہے۔ پنڈی میں ان کے چھ مکان تھے، کالج روڈ پر ڈی۔اے۔وی کالج کے سامنے کوچہ قاضی سراج الدین میں پانچ مکان اور ایک مکان کوچہ قاضی نذیر احمد میں تھا۔ پریس اور اس کی عمارت جدا تھی، جو جامع مسجد کے سامنے ہوا کرتی تھی۔ اس کے علاوہ جب پہلی جنگ عظیم کا آغاز ہوا اور قاضی صاحب نے برطانوی حکومت کی امداد واعانت میں سرگرمی دکھائی تو انھیں تحصیل پھالیہ میں پھلرواں کے متصل پانچ مربعے زمین مل گئی۔ اس طرح قاضی صاحب کی زمینداری گجرات میں بھی ہوگئی۔ گجرات میں قاضی صاحب کا گاؤں چک نمبر ۲۹ کہلاتا تھا، آجکل اس کو چک قاضی رشید احمد بھی کہتے ہیں۔

قاضی صاحب کی زندگی کا ہنگامہ خیز دور یہی ہے۔ ۱۹۱۴ء کی جنگ شروع ہوئی۔ ڈپٹی کمشنر راولپنڈی کی مرتبہ رپورٹ سے معلوم ہوتا ہے کہ اس زمانے میں پنجاب بلکہ ہندوستان میں سرکار برطانیہ کی امداد قاضی سراج الدین سے زیادہ کسی نے نہیں کی۔ جنگ کے آغاز ہی میں قاضی صاحب نے بیرسٹری ترک کردی اور پوری تن دہی سے امدادی مہم شروع کی۔ سپاہیوں کی بھرتی کے لیے انہوں نے خاصے لمبے دورے کیے۔ خطوط، پمفلٹوں اور اشتہاروں کے ذریعے پروپیگنڈا کیا۔ فوجی بھرتی کے حمایت میں رسالہ نکالا۔ ان کے اثر رسوخ کی وجہ سے فوج میں بہت لوگ بھرتی ہوئے۔ اکثر دوروں پر قاضی صاحب بھرتی کرنے والے افسروں کے ہمراہ علاقے میں جاتے اور لوگوں کو بھرتی ہونے پر آمادہ کرتے۔ ان کی کوششوں کا نتیجہ تھا کہ راولپنڈی ڈویژن، کشمیر اور پونچھ کے علاقے میں اڑھائی سال کی مدت میں ۴۰ ہزار سے زائد آدمی بھرتی ہوئے۔

۱۹۱۷ء کے آغاز میں حکومت نے ان کی خدمات کے صلے میں قاضی صاحب کو پبلک پروسیکیوٹر مقرر کیا۔ ان فرائض منصبی کی وجہ سے اب وہ بھرتی کے کام میں زیادہ حصہ نہیں لے سکتے تھے، تاہم حکومت کی امداد کے لیے جو فنڈ قائم ہوئے ان میں قاضی صاحب نے بہت کام کیا۔ مئی ۱۹۱۸ء تک قاضی صاحب راولپنڈی کی وار لیگ کے اعزازی سیکرٹری تھے اور اس حیثیت سے ۱۹۱۷ء کے قرضے کی فراہمی میں انہوں نے قابل قدر خدمات انجام دیں۔ پنجاب ایروپلین فنڈ، سولجرز کمسرٹ فنڈ وغیرہ میں بھی قاضی صاحب کا خاصا ہاتھ تھا (رپورٹ ڈپٹی کمشنر راولپنڈی)۔

ان خدمات کے صلے میں حکومت نے قاضی صاحب کو خان بہادر کا خطاب، (گجرات کے ضلع میں) پانچ مربعے زمین، بھرتی کا بیج، جنگی خدمات کا بیج، وائسرائے کی سند اور دوسری اسناد اور خلعتیں عطا

کیں۔

یکم جنوری ۱۹۱۶ء کو انہوں نے ''حقیقت خلافت اور مسلمانوں کا فرض'' کے عنوان سے ۸۹ صفحات کا ایک پمفلٹ شائع کرایا۔ یہ کتابچہ میاں نادر دین ٹھیکہ دار سرائے کالا نے مطبع روز بازار امرت سر سے چھپوا کر شائع کیا۔ شروع میں بارہ صفحے کا ایک دیباچہ ہے جس میں ''اصلاح کی ضرورت اور مصلحین'' کے عنوان سے سر سید کی تحریک کے اکابر کی انگریز پرستی پر تحسین و آفرین کی ہے۔ سر سید نے ۱۸۹۷ء میں ترکی اور یونان کی لڑائی کے سلسلے میں علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ کی مختلف اشاعتوں میں خلافت کے موضوع پر مضامین لکھے تھے؛ ان میں کے پانچ مقالے اور تہذیب الاخلاق کے دو دوسرے مضمون (جو خطبہ میں بادشاہ کا نام اور شیخ الاسلام کے عنوان سے چھپے تھے) قاضی صاحب نے اس رسالے میں چھاپ دیے ہیں۔ سر سید کے مضامین تیرہ صفحے سے ۳۷ صفحے تک ہیں، اس کے بعد قاضی صاحب نے مذہبی اور تاریخی حیثیت سے خلافت پر خود ایک مفصل بحث کی ہے اور انگریزوں کے اولی الامر ہونے پر زور دیا ہے اور مسلمانوں کو ترکی کی حمایت کا دم بھرنے سے روکا ہے۔ قاضی صاحب کا یہ مقالہ ۳۸ صفحے سے ۸۹ صفحے تک پھیلا ہوا ہے۔ انہوں نے ایک پمفلٹ The truth about the Khilafat کے عنوان سے لکھا جس میں ص ا سے لے کر ۲۴ تک سر سید کے انہیں مذکورہ بالا سات مضامین کا انگریزی ترجمہ دیا ہے، اس کے بعد ۲۰ سے لے کر ۶۰ صفحے تک The truth about the Khilafat کے عنوان سے اپنے مضمون ''خلافت کی حقیقت'' کا ترجمہ درج کیا ہے۔ اس ترجمے پر ۲۲ جولائی ۱۹۱۶ء کی تاریخ درج ہے۔ شروع کتاب میں چار صفحے کا ایک مختصر دیباچہ بھی لکھا ہے جو ۲۲ اگست ۱۹۱۶ء کو تحریر کیا گیا۔ کتاب کے اسی سال کم از کم دو ایڈیشن ضرور شائع ہوئے (اس کے بعد بھی کوئی ایڈیشن چھپا ہو تو کچھ عجب نہیں) دوسرا ایڈیشن لاہور کے رپن پریس سے میاں نادر دین ٹھیکے دار سرائے کالا نے طبع کرایا۔ سرورق پر یہ نوٹ بھی درج ہے کہ یہ کتابچہ انگریزی، اردو، فارسی اور عربی زبانوں میں درخواست دینے پر مفت مل سکتا ہے۔

جنگی خدمات میں قاضی صاحب کا ادبی کام صرف اسی قدر ہے۔ ان کے آخر عمر کے دوسرے مشاغل میں تصوف کی طرف بھی جھکاؤ دکھائی دیتا ہے۔ پیر مہر علی شاہ صاحب گولڑوی سے نسبت معنوی بھی آپ نے کی تھی اور بقول صاحب ''یادرفتگان'' ''اکثر ننگے سر پیر بعد از شام و قبل از صبح دربار کریم شہر راولپنڈی میں جاتے تھے۔ انہیں زمینداری کا بھی بڑا شوق تھا؛ کھنہ کے مشرق میں کرنگ ندی کے کنارے مشرق کی جانب ایک بنگلہ، بارہ دری اور فوارے تفریح کے لیے بنوائے، باغات وغیرہ بھی اس علاقے میں لگوائے گئے۔

۲۵ جولائی ۱۹۲۵ء مطابق ۴ محرم ۱۳۴۳ھ بنگلہ نمبر ۱۶۲ متصل کلکتہ آفس اپنی سالی کے ہاں انتقال

کیا۔ غسل میت ان کے سوانح نگار صوفی علی اکبر نے دلایا۔ صوفی صاحب کی کتاب میں وفات کا ذکر ان الفاظ میں درج ہے۔ فوتگی خان صاحب (خان بہادر صاحب؟) سراج الدین احمد ۲۵ جولائی ۱۹۶۵ء مطابق ۲۴ محرم ۱۳۴۳ھ بنگلہ نمبر ۱۶۲ متصل کلکتہ آفس اپنی سالی کے ہاں ہوئی۔ راولپنڈی کے براوٗنی اور اعلیٰ غم ماتم سے ایسے محزوں تھے جیسے کوئی اپنا مرتا ہے۔ غسل میت صوفی علی اکبر ولد مولانا غلام محی الدین صاحب انصاری المعروف کملی والا نے دلوایا۔ صدر لعل کرتی، شہر اور ارد گرد کے گاؤں والوں نے جوں جوں خبر سنی نماز جنازہ میں شرکت فرمائی۔۔۔ حافظ نور محمد صاحب صدر امام جنازہ تھے۔ صدقات عام مسٹر جان محمد صاحب بیرسٹر، خان محمد صاحب آنریری مجسٹریٹ و شیخ محمد حسین پتھر والوں نے تقسیم فرمائے۔ پھر جنازہ بڑی شان و شوکت سے موٹر کاروں پر کھنہ بنگلہ میں دفنایا گیا۔ قبر اس وقت بھی راہ رووں اور آنے جانے والوں کے لیے بارہ دری کے اندر خود بخود کہہ رہی ہے:

نہ گور سکندر ہے نے قبر دارا
مٹے نامیوں کے نشاں کیسے کیسے
زمین چمن گل کھلاتی ہے کیا کیا
بدلتا ہے رنگ آسماں کیسے کیسے

دو بیویوں سے اولاد ہوئی۔ بڑی بیگم سے ایک لڑکی غلام فاطمہ اور قاضی رشید احمد ہوئے۔ غلام فاطمہ عمر میں بڑی تھیں ان کی شادی قاضی صاحب نے اپنی زندگی ہی میں کی تھی۔ فاطمہ بیگم کے تین فرزند ہوئے؛ محمد جلیل، محمد بشیر اور محمد لطیف۔ ۸ جون ۱۹۲۵ء کو والد کی زندگی ہی میں یہ عفیفہ بیوہ ہوگئیں۔ قاضی رشید احمد خاندانی یادداشت کے مطابق ۱۱۸ کتوبر ۱۸۹۸ء کو منگل کے روز پیدا ہوئے۔ قاضی سراج الدین صاحب کی اولاد نرینہ میں بڑے یہی تھے لیکن ان کی شادی باپ کی وفات کے بعد اپنے چچا کے ہاں ہوئی۔ قاضی صاحب کی دوسری بیوی سے تین لڑکے اور تین لڑکیاں ہوئیں۔ علاؤ الدین ان بھائیوں بہنوں میں بڑے تھے، ان سے چھوٹے آفتاب احمد اور پھر منیر احمد ہوئے۔ بیٹیوں میں آبرو بیگم فوت ہوگئیں، ماہ رو سلطانہ اور آرزو سلطانہ زندہ ہیں۔

(۷)

قاضی صاحب کی وفات کے بعد ان کی اولاد میں جائداد کے سلسلے میں جھگڑا ہوا، جس پر اولاد میں مقدمے بازی بھی ہوئی۔ چھوٹی بیگم نے پنڈی شہر کی تمام جائداد فروخت کردی، جو قاضی صاحب کے چھوٹے بھائی صدیق احمد نے خرید لی۔ چودھویں صدی پریس کسی غیر نے خریدا، باقی جائداد موجود ہے اور دونوں بیویوں کی اولاد اس سے فائدہ اٹھاتی ہے۔ قاضی رشید احمد صاحب کے چار لڑکے ہوئے جن

میں سے دو بچپن ہی میں فوت ہو گئے۔ان میں سے ایک کا نام اعجاز احمد تھا، تاریخی نام اس کا مجید اصغر رکھا گیا تھا۔خاندانی یادداشت کے مطابق اتوار کے روز ۲ فروری ۱۹۳۰ء کو پیدا ہوئے۔تیسرے لڑکے کا نام پھر اعجاز احمد رکھا گیا، یہ سنہ ۱۹۳۳ء میں پیدا ہوئے۔(اس مضمون کی تیاری میں ان سے بڑی مدد ملی ہے)ان سے چھوٹے ریاض فاروقی اسلامیہ کالج گوجرانوالہ میں ریاضی کے لیکچرار تھے اب پالی ٹیکنک انسی ٹیوٹ لاہور میں استاد ہیں۔قاضی رشید احمد تقسیم سے بہت پہلے کلکتے چلے گئے تھے اور وہاں ایک عرصے تک بھاٹا چاریہ کمپنی میں ملازم رہے۔۱۹۴۵ء میں راولپنڈی آ گئے۔اسی سال ان کی حقیقی والدہ نے انتقال کیا۔قاضی رشید احمد صاحب نے ایک آدھ سال وارڈ راشننگ آفیسر کے عہدے پر ملازمت کی،ان کا انتقال ۱۹۴۹ء میں ہوگیا۔دوسری بیگم اوران کی اولاد راولپنڈی ہی میں مقیم ہے۔

کتابیات

(1) یادرفتگاں (قلمی) علی اکبر کملی والانسخہ مملوکہ اعجاز فاروقی۔

(2) راولپنڈی کے ڈپٹی کمشنر کی رپورٹ کا اقتباس (مہیا کردہ اعجاز فاروقی)۔

(3) حیات شبلی (مطبوعہ) سید سلیمان ندوی۔

(4) مقدمہ شعروشاعری (مطبوعہ) حالی۔ مرتبہ راقم۔

(5) خاندانی یادداشت (قلمی) مہیا کردہ اعجاز فاروقی۔

(6) مکتوبات حالی (مرتبہ شیخ اسمٰعیل پانی پتی)۔

(7) البصیر (شبلی نمبر)۔

(8) حیات جاوید (مطبوعہ) حالی (طبع ثالث) مملوکہ پنجاب یونیورسٹی لائبریری۔

(9) نقوش (مکاتیب نمبر)۔

(10) تعلیم (مطبوعہ) مملوکہ پنجاب یونیورسٹی لائبریری۔

(11) سیرۃ الفاروق (طبع ثانی) قاضی سراج الدین (نسخہ مملوکہ راقم)

(12) حیات صلاح الدین (طبع ثانی) مملوکہ پنجاب یونیورسٹی لائبریری۔

(13) داستان پاستاں۔ سلسلہ اول

(i) جلد اول (مطبوعہ) مملوکہ پنجاب یونیورسٹی لائبریری

(ii) جلد دوم (مطبوعہ) مملوکہ پنجاب یونیورسٹی لائبریری (دو نسخے)۔

(iii) جلد سوم (مطبوعہ) مملوکہ پنجاب یونیورسٹی لائبریری (دو ایڈیشن)۔ سلسلہ دوم

(i) حجاج بن یوسف (مطبوعہ) مملوکہ پنجاب یونیورسٹی لائبریری (دو نسخے)۔

(14) حقیقت خلافت اور مسلمانوں کا فرض (مطبوعہ) مملوکہ پنجاب یونیورسٹی لائبریری۔

(15) The truth about the Khilafat (مطبوعہ) مملوکہ راقم۔

(16) خطوط سرسید (مرتبہ سرراس مسعود) طبع اول۔

(17) لیکچر مسلمانوں کی نماز پر (طبع ثانی) ۱۹۱۱ء مملوکہ راقم الحروف۔

علامہ اقبال کی زندگی کی بعض تفصیلات

(۱)

علامہ اقبال کی زندگی اور کارناموں پر ہر سال بے شمار مضامین نکلتے ہیں اور کتابیں شائع کی جاتی ہیں۔ان کی تفصیل خواجہ نورالٰہیٰ کی A Bibliography of Iqbal کے علاوہ کلید اقبال از نذیر احمد اور قاضی احمد میاں اختر مرحوم کی کتاب ''اقبالیات کا تنقیدی جائزہ'' میں درج ہے، پاکستان کے عظیم شاعر کو جو خراج عقیدت پیش کیا جاتا رہا ہے اس کی مقدار قابل تعریف ہے لیکن اگر عقیدت مندی اور اقبال پرستی کے پردے کو ہٹا کر دیکھا جائے تو اس کی کئی سو من کتابوں کے ڈھیر میں اقبال کے کارناموں کا قابل قدر جائزہ صرف چند مختصری کتب تک محدود ہو کر رہ جائے گا۔یوں تو وہ کون سا پہلو ہوگا جس پر اقبالی نقادوں نے قلم نہیں اٹھایا اور ان کی زندگی کا کون سا گوشہ ہے جس کی جانب مورخین نے توجہ نہ کی ہو لیکن یہاں بھی اگر نقطہ ونظر کی کسوٹی پر پرکھنے کا سوال آئے گا تو اہل جستجو کو مایوس ہونا پڑے گا۔ اقبال کے حالات زندگی پر ایک نہیں بیسیوں کتابیں شائع ہو چکی ہیں، چراغ حسن حسرت کی ''حیات اقبال'' سے لے کر مولانا عبدالمجید سالک کی ''ذکر اقبال'' تک کتابوں کی خاصی تعداد ہے لیکن اگر بغور دیکھا جائے تو اقبال کی زندگی کے بعض اہم واقعات وسنین اصلاح طلب دکھائی دیتے ہیں۔عقیدت مندی اچھی چیز ہے لیکن عقیدت مند کا یہ بھی فرض ہے کہ اپنے ہیرو سے دیانت دارانہ سلوک کرے ورنہ اس کی عقیدت مندی سہل انگاری ہی کا دوسرا نام قرار پائے گی اقبال کی زندگی کے واقعات کی صحت ان کی چھان بین اور ترتیب وتدوین اقبال کے ماننے والوں کے فرائض میں داخل ہونی چاہیے۔اس ترقی کے زمانے میں، جب تحقیق اور تنقید کے ذرائع لامحدود ہو گئے ہیں، ملی سرمائے کی حفاظت اور تدوین کا تقاضا یہ ہے کہ ہم اقبال کے بارے میں سنی سنائی باتوں غیر معتبر روائتوں، قلم برداشتہ لکھنے والے عقیدت مندوں اور اشعار کا Paraphrase کرنے والے نقادوں سے یہ بھی پوچھیں کیا اقبال کی قدر دانی کا یہی معیار ہے؟ کیا ہمارے تنقیدی اصول اقبال کی عظمت کو منوانے کی بجائے محض کلام اقبال میں اپنے ذاتی معتقدات کی تلاش وجستجو میں تو نہیں کھو

گئے؟ اقبال کے انتقال سے لے کر اب تک ہم نے اقبال کے ساتھ کیا کیا سلوک نہ کیا ہوگا؟ ہم نے اسے جاگیردارانہ نظام کا حامی بھی ثابت کیا۔ اشتراکیت کا مخالف بھی، اشتراکیت پرور بھی، فسطائیت کا علم بردار بھی جمہوریت کا داعی بھی، غرض کہ ہر ذاتی میلان کی تلاش کلام اقبال میں ہوتی رہی، لیکن اقبال کیا تھے؟ ان کا نقطہ نظر کیا تھا؟ وہ کس عقیدے کے حامی اور کس کے مخالف تھے؟ اقبالیات کے منوں ڈھیر میں ایسی کتنی کتابیں ہیں جو واقعی اقبال کو صحیح تناظر میں پیش کرتی ہیں۔

(۲)

حیات اقبال کی تدوین کے کام ابھی رکے پڑے ہیں۔ ان کا زمانہ بہت دور کا زمانہ نہیں۔ ابھی انہیں جاننے والے موجود ہیں۔ ابھی ان کی زندگی وقت کی گرد سے محفوظ ہے اگر سائنٹفک ذرائع سے کام لے کر ابھی سے حیات اقبال کی تدوین نہ کی گئی تو چند برس کے بعد یہ کام شاید زیادہ وقت طلب ہو جائے۔ اب تک حیات اقبال کی تلاش کی طرف سے غفلت رہی ہے اور محققین نقل در نقل کے اصول چل کر ایک دوسرے کے بیانات پر اکتفا کرتے رہے ہیں۔ مولوی احمد دین کی کتاب اور ملفوظات اقبال ہی پر ہماری تحقیقی مساعی کا سلسلہ ختم ہو جاتا ہے۔ چراغ حسن حسرت کی ''حیات اقبال'' طاہر فاروقی کی ''سیرت اقبال'' اور مولانا عبدالمجید سالک کی ''ذکر اقبال'' اپنی حدود میں کارآمد اور مفید ہونے کے باوجود مذکورہ بالا دونوں مآخذ پر منحصر ہیں۔ علامہ اقبال کی زندگی کے بعض واقعات وکوائف ابھی تک نظروں سے اوجھل ہیں۔ اقبال کی پیدائش کے سنہ کا مسئلہ بھی متنازعہ فیہ چلا آرہا ہے۔ روزگار فقیر میں پہلی بار اس عقدے پر فقیر سید وحید الدین نے کسی قدر روشنی ڈالی ہے۔ انہوں نے میونسپل کمیٹی سیالکوٹ کے رجسٹر پیدائش کے اندراج پر بحث کر کے بتایا ہے کہ یہ اندراج علامہ اقبال کے بڑے بھائی کی پیدائش کے بارے میں ہے جس کا انتقال شیر خواری کی عمر میں ہو گیا تھا۔ (۱)

علامہ اقبال کے پاسپورٹ (۱۹۳۱ء) میں ان کی پیدائش ۱۸۷۶ء، (۲) اور پی ایچ ڈی کے مقالے ۱۹۰۸ء کے شروع کے نوٹ میں ۳ ذیقعدہ ۱۲۹۴ھ مطابق ۱۸۷۶ء لکھا ہے۔ (۳) اس پر بحث کر کے دیگر شواہد کی مدد سے ان کی پیدائش ۳ ذی قعدہ ۱۲۹۴ھ بروز جمعہ مطابق ۹ نومبر ۱۸۷۷ء کو صحیح قرار دیا گیا ہے۔ (۴) اس سلسلے میں یہ اطلاع بھی شاید بے موقع نہ ہوگی کہ پنجاب یونیورسٹی کے بی اے کے امتحان کے فارم میں ہر طالب کو اپنی عمر کا اندراج کرنا ہوتا تھا۔ علامہ اقبال کا بی اے کا نتیجہ پنجاب یونیورسٹی کیلنڈر میں درج ہے۔ علامہ کی عمر بہ مطابق فارم داخلہ ۱۹ برس مرقوم ہے۔ علامہ نے یہ امتحان ۱۸۹۷ء میں پاس کیا۔ (۵) اس حساب سے بھی ان کی پیدائش کا مذکرہ بالا تخمینہ صحیح معلوم ہوتا ہے۔

اس کے علاوہ حیات اقبال کے مختلف گوشوں کی چھان بین میں ڈاکٹر عاشق حسین بٹالوی کی ''اقبال کی زندگی کے آخری دو سال'' مولوی عبداللہ قریشی کا سلسلہ مضامین ''حیات اقبال کی گم شدہ کڑیاں'' (۶) اور'' اقبال اور کشمیر'' (۷) ہے۔ Some Aspects of Ibqals Biography (۸) اقبال کا تعلیمی سفر (۹) خاصے کی چیزیں ہیں اور حیات اقبال کے بعض پہلوؤں پر کارآمد مواد فراہم کرتی ہیں سید محسن ترمذی نے ہائی کورٹ کی فائل پر پاکستان ٹائمز میں جو مقالہ لکھا وہ بھی کچھ نیا مواد سامنے لاتا ہے۔ (۱۰) کرنل عبدالرشید کا علامہ کے نکاح نامے کے سلسلے میں خط (مطبوعہ پاکستان ٹائمز) اور اس سلسلے کی بحث وتمحیص بھی اقبالیات کے اس نقل درنقل کے اصول سے انحراف کر کے بعض نئے انکشافات کی حامل ہے، لیکن یہ مستثنیات میں سے ہیں اور حیات اقبال پر ابھی تفصیلی کام کی بڑی گنجائش اور ضرورت ہے۔

(۳)

اقبال نے اپنی تعلیمی زندگی کے بارے میں خطوط میں تفصیل کے ساتھ اظہار رائے نہیں کیا، چند بکھرے ہوئے اشاروں سے قطع نظر، شاد اقبال (مرتبہ ڈاکٹر زور) میں اقتباس اہم ہے۔
علامہ نے مہاراجہ کشن پرشاد کے نام ۱۵ اپریل ۱۹۱۷ء کو جب حیدرآباد (دکن) ہائی کورٹ کی ججی کے سلسلے میں اقبال کا نام لیا جا رہا تھا۔ اپنی تعلیمی قابلیت کا ذکر بدیں الفاظ کیا ہے۔

> ''اس جگہ کے لیے فلسفہ دانی کی چنداں ضرورت نہیں، تاہم یہ کہنا ضروری ہے کہ اس فن میں میں نے ہندوستان اور یورپ کے اعلیٰ ترین امتحان انگلستان (کیمبرج)، جرمنی (میونخ) یونی ورسٹیوں کے پاس کیے۔ انگلستان سے واپس آنے پر لاہور گورنمنٹ کالج میں مجھے فلسفے کا اعلیٰ پروفیسر مقرر کیا گیا تھا۔ یہ کام میں نے ۱۸ ماہ تک کیا اور یہاں کی اعلیٰ ترین جماعتوں کو اس فن کی تعلیم دی۔ گورنمنٹ نے بعد ازاں یہ جگہ مجھے پیش بھی کی۔ مگر میں نے انکار کر دیا۔ میری ضرورت گورنمنٹ کو کس قدر تھی اس کا اندازہ اس سے ہو جائے گا کہ پروفیسری کے تقرر کی وجہ سے میں صبح کچہری نہ جا سکتا تھا۔ جج ہائی کورٹ کو گورنمنٹ کی طرف سے ہدایت کی گئی کہ میرے تمام مقدمات دن کے پچھلے حصے میں پیش ہوا کریں، چنانچہ ۱۸ ماہ تک اس پر عمل درآمد ہوتا رہا مگر اس عہدے کے لیے جو حیدرآباد میں خالی ہوا ہے، غالباً عربی دان کی زیادہ ضرورت ہوگی اس کے متعلق یہ

امر سرکار کے گوش گزار کرنا ضروری ہے کہ عربی زبان کے امتحان میں میں اول رہا ہوں، انگلستان میں مجھ کو عارضی طور پر چھ ماہ کے لیے لندن یونیورسٹی کا عربی کا پروفیسر مقرر کیا گیا تھا واپسی پر پنجاب اور الہ آباد کی یونی ورسٹیوں میں عربی اور فلسفہ میں بی اے اور ایم اے کا ممتحن مقرر کیا گیا اور اب بھی ہوں۔ امسال الہ آباد یونیورسٹی کے ایم اے کے دو پرچے میرے پاس تھے۔ پنجاب میں بی اے کی فارسی کا ایک پرچہ تھا پنجاب میں بی اے اور ایم اے فلسفے کے دو پرچے میرے پاس ہیں۔ علاوہ ان مضامین کے میں نے پنجاب گورنمنٹ کالج میں علم اقتصادیات، تاریخ اور انگریزی بی اے کی جماعتوں کو پڑھایا ہے اور حکام بالادست سے تحسین حاصل کی ہے۔

تصنیف و تالیف کا سلسلہ بھی ایک عرصے سے جاری ہے۔ علم اقتصادیات پر اردو میں سب سے مستند کتاب میں نے لکھی۔ انگریزی میں چھوٹی چھوٹی تصانیف کے علاوہ ایک مفصل رسالہ فلسفہ ایران پر بھی لکھا، جو انگلستان میں شائع ہوا تھا۔ میرے پاس اس وقت یہ کتابیں موجود نہیں ورنہ ارسال خدمت کرتا۔

باقی جو کچھ میرے حالات ہیں وہ سرکار پر بہ خوبی روشن ہیں، ان کے بیان کرنے کی چنداں ضرورت نہیں ہے۔ فقہ اسلام میں اس وقت ایک مفصل کتاب بزبان انگریزی زیر تصنیف ہے، جس کے لیے میں نے مصر و شام و عرب سے مسالہ جمع کیا ہے جو انشاء اللہ بشرط زندگی شائع ہوگی اور مجھے یقین ہے کہ اپنے فن میں ایک بے نظیر کتاب ہوگی۔ میرا ارادہ ہے کہ اس کتاب کو تفصیل مسائل کے اعتبار سے ایسا ہی بناؤں جیسا کہ امام نفسی کی مبسوط ہے جو ساٹھ جلدوں میں لکھی گئی تھی، زیادہ کیا عرض کروں امید ہے کہ سرکار کا مزاج بخیر ہوگا۔ اس طویل خط کے لیے معافی چاہتا ہوں۔ (۱۱)

(۴)

اس اجمال کی کچھ تفصیل ہمیں بعض دوسرے ذرائع سے ملتی ہے گورنمنٹ (کالج) کی تاریخ کے علاوہ پنجاب یونیورسٹی کے کیلنڈر (۱۲) اور اورینٹل کالج کی انتظامی رودادیں اقبال کی زندگی اور تعلیمی سرگرمیوں پر روشنی ڈالتی ہیں اور اقبال کے بارے میں بعض مغالطوں میں غلط بیانات کی تردید کرتی ہیں۔

اقبال کے تعلیمی سفر کا آغاز سیالکوٹ سے ہوتا ہے۔ انہوں نے میٹرک کا امتحان ۱۸۹۳ء میں پاس کیا۔ اس زمانے میں سیالکوٹ میٹرک کے امتحان کا سنٹر نہ تھا بلکہ اس کے بعد تک بھی سیالکوٹ میں سنٹر قام نہیں ہوا تھا۔ قریب کے سنٹر گجرات، سری نگر اور لاہور تھے (۱۳) اقبال نے سری نگر سے امتحان نہیں دیا، اس لیے کہ خود کہتے ہیں۔ ''میں ۱۹۱۷ء تک کشمیر نہیں دیکھ سکا۔ (۱۴)'' یہ امتحان انہوں نے یا تو گجرات جا کر دیا یا پھر لاہور میں دیا ہوگا۔

انٹر میڈیٹ کی تعلیم انہوں نے سکاچ مشن کالج سیالکوٹ سے حاصل کی۔ کالج کی تاسیس ۱۸۸۸ء میں ہو چکی تھی۔ اقبال کی تعلیم کے زمانے میں یہ کالج گورنمنٹ سکول کی عمارت میں واقع تھا اور کالج کا سٹاف پانچ استادوں پر مشتمل تھا، جان ڈبلیو ینگسن، ڈی ڈی (پرنسپل)، نرنجن داس بی۔اے، ہرنام سنگھ بی۔اے، پنڈت تیرتھ رام اور مولوی میر حسن (۱۵)۔ اس زمانے میں کالج میں جن مضامین کی تدریس کا انتظام تھا وہ تھے انگریزی، فلسفہ، ریاضی، سائنس، عربی، فارسی اور سنسکرت (۱۶)۔ ذکر اقبال میں ہے:

> ''چونکہ اس وقت تک سکاچ مشن ہائی سکول میں انٹر میڈیٹ کی کلاسیں کھل گئی تھیں اور اس کا نام سکاچ مشن کالج ہو گیا تھا، اس لیے اقبال نے انٹرنس پاس کرنے کے بعد ایف اے کی تعلیم بھی وہیں جاری رکھی۔ مولانا ابراہیم سیالکوٹی کا بیان ہے کہ اس وقت حسب ذیل اساتذہ اس سکول اور کالج میں پڑھاتے تھے۔ (۱) ماسٹر غلام علی (اقبال شیدائی کے والد) (۲) ماسٹر پالامل (۳) منشی امام دین (۴) مولانا سید میر حسن (۵) مسٹر ڈیوڈ ہیڈ ماسٹر (۶) ماسٹر ٹہل سنگھ (عیسائی) مسٹر وی ڈی سنگھا (جو بعد میں بیرسٹر ہو گئے) (۸) پادر ینگسن (سکاچ مشن) (۹) جارج واخ پرنسپل سکاچ مشن کالج۔ (۱۷)

سالک اور ابراہیم سیالکوٹی صاحب کا یہ بیان محل نظر ہے۔ مشن سکول کے سٹاف سے قطع نظر، اس زمانے میں جارج واخ پرنسپل نہیں تھے، بلکہ یہ ینگسن کا دور ہے۔ ۱۸۹۷ء میں مشن کالج کے سٹاف میں تبدیلیاں آئیں تو اس وقت پادری واخ ایم اے۔ بی ڈی پرنسپل مقرر ہوئے۔ (۱۸) اس سے قبل کالج سٹاف سے واخ کا کوئی تعلق ثابت نہیں ہے اور نہ اس زمانے میں یہ کالج مشن سکول کی عمارت میں ہوا کرتا تھا۔ اقبال نے ایف۔اے کا امتحان ۱۸۹۸ء میں پاس کیا اور لاہور چلے آئے۔

لاہور میں اقبال نے گورنمنٹ کالج میں داخلہ لیا۔ یہاں کی تعلیم کے بارے میں ذکر اقبال میں ہے:

> ۱۸۹۵ء میں اقبال لاہور آئے گورنمنٹ کالج کی بی۔اے کلاس میں داخل ہوئے اور انگریزی، فلسفہ اور عربی کے مضامین لیے۔ ۱۸۹۷ء میں بی۔اے نہایت امتیاز کے ساتھ پاس کیا وظیفہ پایا، اور عربی اور انگریزی میں اول آنے کی وجہ سے دو طلائی تمغے بھی حاصل کیے۔ اس زمانے میں پروفیسر ٹامس آرنلڈ علی گڑھ سے قطع تعلق کر کے گورنمنٹ کالج لاہور میں فلسفہ کے پروفیسر مقرر ہو گئے تھے۔ ایک تو اقبال کا اپنا رجحان فلسفے کی طرف تھا، اس پر آرنلڈ جیسے نامور فلسفی کی شاگردی کا موقع ملا۔ چنانچہ اقبال نے فلسفے کے ایم اے میں داخلہ لے لیا۔ پروفیسر آرنلڈ چند ہی روز میں اقبال کی صلاحیتوں سے ایسے متاثر ہوئے کہ انہوں نے اقبال سے دوستانہ برتاؤ شروع کر دیا۔ اقبال نے ۱۸۹۹ء میں ایم اے پاس کیا اور یونیورسٹی بھر میں اول آئے اس لیے طلائی تمغہ بھی حاصل کیا۔(۱۹)

اس مختصر سے بیان میں کئی باتیں محل نظر ہیں۔ ''امتیاز کے ساتھ پاس کیا''۔ ''عربی اور انگریزی میں اول آئے۔'' آرنلڈ کی ابتدا ہی سے خصوصی شاگردی، فلسفے کی ابتدا ہی سے میلان، آرنلڈ کا چند ہی روز میں دوستانہ برتاؤ اور ایم۔اے کی کامیابی، یہ سب بیانات مبالغہ آمیز اور حد درجہ مبالغہ آمیز اور نا قابل اعتبار ہیں۔ جب اقبال نے بی۔اے میں داخلہ لیا اس وقت آرنلڈ ابھی علی گڑھ میں تھے۔

اس زمانے میں گورنمنٹ کالج کا سٹاف ان استادوں پر مشتمل تھا:

(۱) مسٹر ڈبلیو بیل (W.Bell) ایم۔اے، پرنسپل اور پروفیسر انگلش لٹریچر ۱۸۹۵ء میں طویل رخصت پر چلے گئے، اور ان کی جگہ مسٹر ڈالنجر (P.G.Dallinger) پرنسپل اور مسٹر ہرسٹ (Hirst) تاریخ کے استاد مقرر ہوئے۔(۲۰)

(۲) پی۔جی ڈالنجر (P.G.Dallinger) بی۔اے (پرنسپل) پروفیسر تاریخ۔

(۳) جی۔بی اوشر (Ussher) پروفیسر فلسفہ (۱۸۹۸ء میں مستعفی ہوئے۔)

(۴) لالہ جیا رام ایم۔اے اسسٹنٹ پروفیسر تاریخ و فلسفہ۔(۲۱)

اقبال نے بی۔اے کے زمانے میں فلسفہ، لالہ جیارام اور پروفیسر اوشر سے پڑھا، انگریزی کی تعلیم ڈالنجر سے حاصل کی ہوگی۔ اس زمانے میں گورنمنٹ کالج کا عربی کی تعلیم کا اپنا انتظام الگ نہ تھا بلکہ اورینٹل کالج کے اساتذہ ہی ان مضامین کی تدریس کرتے تھے۔ ۱۸۶۴ء میں گورنمنٹ کالج قائم ہوا تھا تو مشرقی

علوم کی تدریس کا انتظام اول مولوی علم دار حسین کے سپرد ہوا تھا۔ ۱۸۷۰ء میں ان کے انتقال پر مولانا محمد حسین آزاد پروفیسر ہوئے ابتدأ گورنمنٹ کالج کے طلبا کلکتہ یونیورسٹی کے امتحانات میں شریک ہوا کرتے تھے۔ ۱۸۶۵ء میں پنجاب یونیورسٹی کے قیام کے لیے عملی اقدامات شروع ہوئے۔ اس کے نتیجے میں ۸ دسمبر ۱۸۶۹ء میں یونیورسٹی کالج کی تاسیس ہوئی۔ جو درحقیقت ایک امتحان لینے کا ادارہ تو تھا لیکن ڈگری دینے کا مجاز نہ تھا۔ یونیورسٹی کی سینٹ کی پہلی باقاعدہ نشست ۱۱ جنوری ۱۸۷۰ء کو ہوئی۔ ایک کمزور سے انتظامی تاگے سے اورینٹل کالج اور یونیورسٹی کو باندھ دیا گیا۔ آخر کار پنجاب یونیورسٹی ایک فعال ادارے کے طور پر ۱۸۸۲ء کے ایکٹ سے وجود میں آئی اور امتحانات اور تدریس کا جزئی بار بھی اس کے کندھوں پر تھا۔ اورینٹل کالج یونیورسٹی کا شعبہ بنادیا گیا۔ گورنمنٹ کالج کا عربی فارسی کا عملہ اس کالج کا پہلا سٹاف قرار دیا گیا۔ (۲۲) ۱۸۸۴ء اورینٹل کالج گورنمنٹ کالج کی عمارت کا آدھا مشرقی حصہ اور شمالی ونگ کا پہلا فلور اور ینٹل ونگ کا پہلا فلور اورینٹل کالج کہلاتا تھا اور پرنسپل کے دفتر کے متصل کرنے کا چھوٹا کمرہ لا سکول تھا (۲۳)۔ گورنمنٹ کالج کے طلبا عربی فارسی کے مضامین اورینٹل کالج کے استادوں سے پڑھنے لگے۔

علامہ اقبال جن دنوں بی۔اے میں تھے۔ اس وقت یہی انتظام چل رہا تھا اور گورنمنٹ اس خدمت کے صلے میں اورینٹل کالج کو مالی امداد دیتی تھی۔ (۲۴)

اس زمانے میں اورینٹل کالج کا سٹاف ۱۸ استادوں پر مشتمل تھا۔ ایم اے سٹائن، پی۔ایچ۔ڈی (پرنسپل و پروفیسر سنسکرت) مولوی محمد عبداللہ ٹونکی ہیڈ مولوی، قاضی ظفرالدین نائب مولوی، ایم عبدالکریم ہیڈ منشی، ایم۔محمد دین ایم۔او ایل نائب منشی (بیماری کی رخصت یکم نومبر ۱۸۹۸ء انتقال ۲۶ نومبر ۱۸۹۸ء) (۲۵) ایم۔اے رشید احمد زائد عربی ٹیچر، چوہدری علی گوہر ایم اے میکلوڈ عربک ریڈر، محمد علی ایم اے پٹیالہ ٹرانسیٹر ان میں سے بی اے کی تدریس محمد دین کے سپرد تھی اور اقبال کے عربی کے استاد یہی تھے (۲۶)۔ ان کا ٹائم ٹیبل یہ تھا۔

III Year Class

Arabic: 6 periods weekly Punjab University

Arabic B.A

Course,PP.1-116 .4 Period Saba-Muallaqa parts I- IV Excercises in Translation, 1 period Moulvi Muhammad Din. M.O.L.

IV Year class

Arabic 6 periods weekly Saba-Muallaqa- 1 period, Punjab university B.A Arabic course:

4 period.
Exercises in Translation: 1 Period Maulvi Muhammad Din M.O.L.(۲۷)

اقبال نے بی اے کا امتحان مارچ ۱۸۹۷ء میں دیا رول نمبر ۱۹۶ تھا۔ اس امتحان میں علامہ اقبال نے سکینڈ ڈویژن میں کامیابی حاصل کی۔(۲۸) اقبال اور مدن گوپال اگروال کے نمبر برابر تھے۔ یعنی ۲۶۰ چارلڑ کے فرسٹ ڈویژن میں کامیاب ہوئے اس لحاظ سے اقبال اور گروال کی پوزیشن یونیورسٹی میں گیارہویں تھی(۲۹) نتیجے کا گوشوارہ یہ ہے:

گوشوارہ

بی۔اے کے امتحان میں اقبال نے کوئی وظیفہ حاصل نہیں کیا، کیونکہ اس زمانے میں آرٹس کے طلبا کے صرف تین وظیفے تھے اور اقبال اس کے حق دار نہ تھے(۳۰) انگریزی میں بھی فرسٹ نہیں آئے، البتہ انہوں نے تمغے ضرور حاصل کیے۔ تفصیل یونیورسٹی کیلنڈر میں ان الفاظ میں درج ہے۔

P.S.Jamal-ud-Din Medal.	Sheikh Muhammad Iqbal. Govt College.Lahore, for obtaining the hihest number of marks in Arabic while passing the B,A Examination
Khalifa Muhammad Hussain Aticheson Medal	Muhammad Iqbal for Standing first on the best of successful candidate at the B.A Examination whose first language was Eng and the second language Arabic.(۳۱)

بی۔اے پاس کرنے کے بعد اقبال نے اسی سال ایم۔اے فلسفہ میں داخلہ لیا اور ڈانجر ہی سے درس پانے لگے۔ ۱۸۹۸ء کے نتائج میں فلسفے کے طلبا میں اقبال کا نام نہیں ملتا، یا تو اقبال اس سال امتحان میں نہیں بیٹھے جس کا بہ ظاہر کوئی قرینہ نہیں، یا پھر وہ اس بار ناکام رہے۔ ان دنوں ایم اے کا امتحان ایک

سال میں ہوتا تھا اور یہ طریقہ پنجاب یونیورسٹی میں ۱۹۱۴ء تک برابر رائج رہا۔ (۳۲) ۱۱ فروری ۱۸۹۸ء کو آرنلڈ علی گڑھ سے آکر فلسفے کے پروفیسر ہو گئے اور اقبال اب ان سے درس لینے لگے اسی سال مسٹر اوشر نے استعفیٰ دے دیا تھا اور ان کی جگہ لالہ جیارام عارضی پروفیسر فلسفہ کر دیے گئے تھے۔ سنٹرل ماڈل سکول سے مولوی عمر الدین، جیارام کی جگہ انگریزی، فلسفہ اور تاریخ کے اسسٹنٹ پروفیسر ہو گئے تھے۔ جب آرنلڈ علی گڑھ محمڈن اورینٹل کالج سے یہاں آ گئے تو جیارام اسسٹنٹ پروفیسر کر دیئے گئے اور مولوی عمر الدین اپنی سابقہ ملازمت پر چلے گئے تھے۔ (۳۳) ۱۳ فروری ۱۸۹۷ء میں گورنمنٹ کالج میں انگریزی اور فلسفے کا سٹاف یہ تھا۔

(۱) رابسن پرنسپل اور پروفیسر انگریزی (مسٹر ڈیلنجر نے ۱۸۹۸ء میں استعفیٰ دے دیا تھا اور ان کی جگہ رابسن پرنسپل کر دیئے گئے تھے۔ (۳۴) رابسن ۱۹۱۲ء تک پرنسپل رہے۔ ان کے ریٹائر ہونے پر میجر سٹیفنسن پرنسپل بنا دیئے گئے تھے۔)

(۲) لالا جیارام (پہلے پروفیسر فلسفہ اور آرنلڈ کے آنے پر اسسٹنٹ پروفیسر، انگریزی اور تاریخ)۔

(۳) مولوی عمر الدین (جیارام کی جگہ اسسٹنٹ پروفیسر، بعد میں آرنلڈ کے آنے پر واپس سنٹرل ماڈل سکول میں چلے گئے) ادھر لاہور لا سکول کا یہ عالم تھا کہ اس کی تاسیس ۱۸۷۰ء میں ڈاکٹر لائٹنر کی سعی سے ہو گئی تھی۔ ابتدا میں کلاسیں کچھ عرصہ کڑی باغ کی عمارت (موجودہ اے جی آفس) میں ہوتی تھیں بعد کو گورنمنٹ کالج کی موجودہ عمارت ہی کے ایک کمرے میں ہونے لگیں۔ گورنمنٹ کالج کے طلبا کو ایم۔ اے کے ساتھ ہی ایک سال میں دونوں امتحان دے ڈالنے کی اجازت تھی، اسی وجہ سے عموماً اس زمانے میں گورنمنٹ کالج کے نتائج اچھے نہ آتے تھے (۳۵) یونیورسٹی لاہور لا سکول کے امتحانات (پلیڈر شپ اور مختاری) لینے کی مجاز ہو چکی تھی (۳۶) لاہور لا سکول میں تین جماعتیں تھیں:

(1) Preliminary
(2) First Certificate
(3) Licenciate in Law

لاہور لا سکول میں مندرجہ ذیل اساتذہ کام کرتے تھے۔

(۱) پی مارٹن بار ایٹ لا (لا لیکچرار یعنی انچارج لاہور لا سکول)۔

(۲) لالہ لال چند ایم۔ اے پلیڈ چیف کورٹ لاہور اسسٹنٹ لا لیکچرار

(۳) سی گوکل ناتھ، بی۔اے ایل ایل بی۔یڈیشنل لار یڈر۔

(۴) لالہ سرداری لال، ایل ایل، پلیڈر۔دوسرا اسسٹنٹ لیکچرار

(۵) لالہ سنگرام، ایل، ایل، پلیڈر لار یڈر۔

یہ لوگ تمام جماعتوں کی تدریس کرتے تھے۔اقبال نے (جیسا کہ سید محسن نقوی صاحب کے مقالے مطبوعہ پاکستان ٹائمز ۲۲ اپریل ۱۹۵۵ء میں ۶،۵ سے معلوم ہوتا ہے) لا کی پہلی جماعت میں داخلہ لیا اور سالانہ امتحان میں بیٹھے، لیکن فقہ کے پرچے میں فیل ہو گئے۔(۳۷) اس امتحان کے لیے کم از کم ایف۔اے ہونا ضروری تھا۔(اور اقبال تو بی۔اے بھی کر چکے اور ایم۔اے کا ایک سال بھی پورا کر چکے تھے) امتحان کے چار پرچے تھے، ہر پرچے کے ۱۲۰ نمبر تھے۔پرچہ دس سوالات پر مشتمل تھا، پاس ہونے کے لیے ۵۰ فی صد نمبر ضروری تھے۔نیز ایگر گیٹ میں کل نمبروں کا ۵/۳ لینا بھی ضروری تھا۔یونیورسٹی دسمبر میں امتحان لیتی تھی۔نتیجے کا اعلان امتحان کے چار ماہ بعد ہوتا تھا (۳۸)۔پہلے سال کے پرچوں کی ترتیب یہ تھی۔

Parpar I(a) Outlines of General Jurisprudence.

Paper I(b) Outlines of Constitutional Law

PaperII Elements of Contract law and of the law ot Torts

Paper III Principles of criminal liability

Paper IV The law of Evidence.

اس سال امتحان میں ۱۵۳ لڑکے شریک ہوئے تھے اور ۹۴ پاس ہوئے (۳۹)۔اقبال امتحان کے پہلے پرچے میں فیل ہو گئے ادھر اسی سال ایم۔اے (فلسفہ) کے یونیورسٹی امتحان میں اقبال یا تو شریک نہیں ہوئے یا فیل ہوئے۔اس سال ایم۔اے کے مضامین میں شریک ہونے والے طلبا کی کل تعداد ۲۹ تھی اور ان میں سے صرف ۹ پاس ہوئے تھے۔فلسفے کے ایم۔اے میں اس سال صرف ایک ہی طالب علم پاس ہوا تھا اور وہ اقبال نہ تھا۔اقبال نے دوسرے سال فلسفے کے ایم۔اے کا امتحان دیا۔اس زمانے میں ایم اے کے چھ پرچے ہوا کرتے تھے۔امتحان کے پہلے تین پرچوں کے ممتحن مسٹر بیل (Bell) ایم۔اے تھے اور آخری تین پرچوں کے مسٹر پی۔کے رے (Rovy) ڈی۔ایس۔سی تھے۔اس سال اقبال پاس ہو گئے، چنانچہ کیلنڈر میں ۱۸۹۹ء کے نتائج کے تحت لکھا ہے۔(۴۰)

Muhammad Iqbal, Government College Lahore
(Class III Philosophy):

فلسفے کے امتحان پاس ہونے والے واحد شخص اقبال ہی تھے۔انہوں نے یہ امتحان تیسرے درجے میں پاس کیا۔اس امتحان میں کامیابی کے صلے میں انہیں ایک میڈل بھی ملا۔(۴۱) ۱۸۹۹ء کے امتحان

کے میڈلوں کے تحت یہ اندراج موجود ہے۔

Khan Bahadur Nawab Bakhsh Medal .... Muhammad Iqbal B.A Govt College Lahore, for taking the highest position in Philosophy in the M.A Examination.

اس کے بعد اقبال اورینٹل کالج میکلوڈ عربک ریڈر مقرر ہوئے۔ حیات اقبال کے بعض محققین نے انہیں اورینٹل کالج کا پروفیسر لکھا ہے۔ یہ صحیح نہیں ان کا تعلق ریسرچ اسکالر کے طور پر تھا۔ اورینٹل کالج کے کچھ اخراجات یونیورسٹی بعض عطیات (Endowments) سے پورا کرتی تھی۔ بعض فنڈ جو یونیورسٹی کی تحویل میں تھے۔ ان میں سے وظائف کی صورت میں کالج کو مالی امداد ملتی تھی۔ کل چھ وظیفے تھے اور ان سے عربی فارسی وغیرہ کے ریڈر اور ٹرانسلیٹر وں کی آسامیاں پر ہوتی تھیں۔ ان وظائف پانے والے ملازم طلبا کے ذمے مختلف قسم کے فرائض ہوتے تھے۔ میکلوڈ عربک ریڈر کے فرائض تین قسم کے تھے۔

۱۔ عربی کتب نصاب کی چھپائی کی نگرانی

۲۔ عربی یا انگریزی کتابیں اردو میں ترجمہ کرنا

۳۔ اورینٹل کالج میں درس دینا (۴۲)

ریڈر کا تقرر سنڈیکیٹ کرتی تھی اور توثیق سینٹ کے ذمے تھی۔ آسامی خالی ہونے پر وائس چانسلر سنڈیکیٹ کے فیصلے تک تقرر کرنے کا مجاز تھا۔ خصوصاً یہ تقرریاں اپریل کے مہینے میں ہوتی تھیں۔ میکلوڈ ریڈر ہونے کے لیے کم از کم تعلیمی میعار بی۔ اے میں عربی میں امتیاز حاصل کرنا تھا۔ تقرر عموماً تین سال کے لیے ہوتا تھا۔ ایک شخص تین سال پورے کرنے کے بعد دو سال کے لیے مزید وظیفہ حاصل کر سکتا تھا۔ مستعفی ہونے کے لیے کم از کم تین ماہ کا نوٹس دینا ضروری تھا۔ تدریس میں میکلوڈ عربک ریڈر اورینٹل کالج کے شعبہ عربی کے صدر کے ماتحت تھا۔ اس ملازمت کی تنخواہ (یا وظیفہ) ۲۷۸ روپے ماہوار تھی۔ (۴۳) ۲۴ اپریل ۱۸۹۴ء کو شیخ رحیم بخش ایم۔ اے کے مستعفی ہونے پر میکلوڈ عربک ریڈر کی جگہ خالی ہوئی تو اسی سال ایم اے کے کامیاب ہونے والے طالب علم چودھری علی گوہر کو ملازم رکھ لیا گیا۔ چودھری علی گوہر نے یکم مئی ۱۸۹۴ء سے اورینٹل کالج میں تدریس کا کام سنبھال لیا۔ چودھری علی گوہر ایم۔ اے عربی تھے (۴۴)۔ اورینٹل کالج کی رپورٹ سے معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے ۱۸۹۹ء۔ ۱۹۰۰ء کے تعلیمی سال میں ۳۷ دن کی رخصت لی تھی چنانچہ رپورٹ میں یہ اندراج ہے:

> Ch.Ali Gauhar M.A Mcleod Arabic Readers obtained 37 days leave made by the superintendent for carrying on his work

ان کی جگہ ۱۳ مئی ۱۸۸۹ء کو اقبال کا تقرر ہو گیا۔ (۴۵) گورنمنٹ کالج کے استاد فلسفہ پروفیسر آرنلڈ جن سے ایم۔اے کے دوسرے سال میں اقبال درس لیتے رہے) ڈاکٹر ایم۔اے سٹائن (Sten) کے ۲۸ اپریل ۱۸۹۴ء کو اپنے منصب سے سبکدوش ہونے پر اپنے اصل فرائض کے علاوہ اورینٹل کالج کے قائم مقام (Officiating) پرنسپل بھی مقرر ہوئے اور ۲۳ نومبر ۱۸۹۹ء تک یہ خدمات انجام دیتے رہے۔" (۴۶) اسی شفیق استاد کی مساعی سے اقبال کو میکلوڈ عربک ریڈر کی اسامی ملی ہوگی۔ آرنلڈ اس زمانے میں پرنسپل کے علاوہ اورینٹل فیکلٹی کے ڈین بھی تھے۔ ان کا تقرر بہ طور ڈین ۱۸۹۹ء میں ہو چکا تھا (۴۷)۔ چودھری علی گوہر کی ملازمت کے خاتمے اور اقبال کی ملازمت کے آغاز کے بارے میں کالج کے اعداد و شمار کی رپورٹ میں یہ اقتباس ملتا ہے:

the term of appointment of Chaudari Ali Gouhar. M.A,as Mcleod Arabic Reader and M.Muhammad Ali, M.A as Paitala translator, having expired, Sheikh Muhammad Iqbal M.A and M Burkat Ali Khan, M.A were on the 13th and 19 the May 1899 appointed to their respective posts. (۴۸)

اس عہدے پر متمکن ہونے سے اقبال دوگونہ فرائض انجام دینے لگے۔ انہوں نے تحقیقی کام کے سلسلے میں The Doctrine of the Absolute Unity expounded by Al Jilani لکھا۔ (۵۳) یہ مقالہ Indian Antiquary بمبئی کے ۲۹ ویں شمارے میں ۱۹۰۰ء میں شائع ہوا۔ (۵۰) اس کے علاوہ اقبال تدریس کا کام بھی کرتے تھے، اعداد و شمار کی رپورٹ میں اقبال کا نظام الاوقات یوں درج ہے:

B.Q.L Class I and II Year
History and Political Economy, 6 Periods weekly
Secley's expansion of England notes on English and Indian History, Fawcett's Poiltical Economy
Sheikh.Muhammad Iqbal M.A
Intermediate Class II year
Philosophy 6 period weekly, Hudd's Primer of Psychology. Ray,s Deductive Logic, revised. Sheikh Muhammad Iqbal, M.A.
Intermediate Class I year

Philosopy 6 periods weekly. Ray,s Deductive logic. pp 1-100

Sheikh Muhammad Iqbal M.A. (۵۱)

اس زمانے میں پرنسپل اورینٹل کالج کے ماتحت (سکول کا عملہ چھوڑ کر) جو سٹاف کام کر رہا تھا، ان میں اقبال کے علاوہ مولوی محمد عبداللہ ٹونکی (ہیڈ مولوی)، قاضی ظفر الدین (نائب مولوی)، مولوی عبدالحکیم زیرک کلانوری (ہیڈ منشی)، ایم محمد دین (منشی)، رشید احمد (ایڈیشنل عربک ٹیچر) تھے۔ اقبال تدریسی کام میں مولانا عبداللہ ٹونکی کے ماتحت تھے۔

(۹)

مئی ۱۹۰۳ء تک اقبال میکلورڈ عربک ریڈر رہے، لیکن اس دوران میں انہوں نے دو اور ملازمتیں بھی کیں، اسلامیہ کالج لاہور اور گورنمنٹ کالج میں وہ تھوڑی مدت کے لیے تدریس کے کام پر مامور ہوئے۔ انہوں نے اورینٹل کالج سے یکم جنوری ۱۹۰۱ء سے رخصت بلا تنخواہ لی۔ (۵۲) ۱۳ اکتوبر ۱۹۰۲ء کو ہم انہیں گورنمنٹ کالج لاہور میں شعبہ انگریزی میں بطور ایڈیشنل پروفیسر پاتے ہیں۔ یہ وہ زمانہ ہے جب شیخ عبدالقادر (سر عبدالقادر) یونیورسٹی کے فیلو ہو چکے تھے۔ (۵۳) جون ۱۹۰۳ء میں اقبال دوبارہ اسی اسامی پر لوٹ آئے۔ (۵۴) وہ یکم جنوری ۱۹۰۱ء میں یہاں سے اسلامیہ کالج میں استاد ہوئے (تفصیل دوسرے مقالے میں ملاحظہ فرمائیے) اور ۱۳ اکتوبر ۱۹۰۲ء میں گورنمنٹ کالج میں چلے گئے۔ اس حساب سے اسلامیہ کالج کی ملازمت یکم جنوری ۱۹۰۱ء تک چھ ماہ رہی ہوگی وہ اپنی اصل ملازمت پر لوٹنے (۵۵) تو ۲۳ اگست ۱۹۰۲ء کو ڈاکٹر سٹریٹن (A.W.Stratton) کا انتقال ہو گیا اور اکتوبر ۱۹۰۲ء میں آرنلڈ دوبارہ قائم مقام پرنسپل مقرر ہوئے اور ۱۹ اپریل ۱۹۰۳ء تک آرنلڈ اس عہدے پر برقرار تھے۔ (۵۶) آرنلڈ کی پرنسپلی کے اس دوسرے دور سے قبل ہی اقبال کو گورنمنٹ کالج میں ملازمت مل گئی تھی۔

(۱۰)

اورینٹل کالج سے اقبال کا تعلق ۱۳ مئی ۱۸۹۹ء سے ۳۰ جون ۱۹۰۱ء تک یکم جولائی ۱۹۰۲ء سے ۱۳ اکتوبر ۱۹۰۲ء تک اور ۲ مارچ ۱۹۰۳ء سے دو جون ۱۹۰۳ء تک رہا۔ اس دوران میں پہلے انہوں نے اسلامیہ کالج لاہور میں چھ ماہ ملازمت کی، پھر گورنمنٹ کالج میں چھ ماہ ملازم رہے، پھر ۳ جون ۱۹۰۳ء سے ان کا دوبارہ تقرر گورنمنٹ کالج میں ہوا۔ اس حساب سے ان کے اورینٹل کالج کی حقیقی ملازمت کی مدت

۱/۲/۱۳+۵+۳-)ایک سال ساڑھے نو ماہ ہوتی ہے۔

اس دور میں تدریس میں ۱۹۰۲ء۔۱۹۰۱ء کی رپورٹ میں مندرجہ ذیل اندراج پایا جاتا ہے۔

Sheikh Muhammad Iqbal M.A(1) Eptomised Translation of Stubib,s Early Plantagenets(2) Eptomised Translation of walkers Political economy (3) A new work on Political Economy in Preparation. (۵۷)

اس روداد میں ۳۱ مارچ ۱۹۰۲ء کو کالج سٹاف کی تفصیلات درج ہیں، اس میں اقبال کی مدت ملازمت ۲ برس گیارہ مہینے شمار کی گئی ہے۔(۵۸) اس میں نظام الاوقات کا گوشوارہ درج نہیں ہے، اس لیے یہ معلوم نہیں کہ وہ کس کس کلاس کو ہفتے میں کتنا وقت دیا کرتے تھے۔۱۹۰۳ء۔۱۹۰۲ء کی اعداد وشمار کی رپورٹ میں اقبال کے کسی تحقیقی کام کا ذکر نہیں ہے، البتہ اساتذہ کے ذیل میں ان کا نام، تنخواہ اور مدت ملازمت (تین برس گیارہ مہینے، تا ۳۱ مارچ ۱۹۰۳ء) دی گئی ہے۔(۵۹)

۱۹۰۴ء۔۱۹۰۳ء کی روداد سے بھی اقبال کا تصنیفی کام غائب ہے۔اساتذہ کے ذیل میں اقبال کے بجائے شیخ فیروز الدین بہ طور قائم مقام میکلوڈ ریڈر ہوا ہے اور مدت ملازمت ۳۱ مارچ ۱۹۰۴ء تک دس ماہ بیان ہوئی ہے۔(۶۰) ۱۹۰۵ء۔۱۹۰۴ء کی رپورٹ میں بھی ۳۱ مارچ ۱۹۰۵ء تک فیروز الدین قائم مقام میکلورڈ عربک ریڈر میں مدت ملازمت ایک سال دس ماہ شمار ہوئی ہے۔(۶۱) ۱۹۰۲ء۔۱۹۰۵ء کی رپورٹ سے معلوم ہوتا ہے کہ اب فیروز الدین کی جگہ مستقل طور پر شیخ نیاز محمد کام کر رہے ہیں اور ۳۱ مارچ ۱۹۰۶ء تک انہیں کام کرتے ہوئے ایک سال اور دس ماہ ہو گئے ہیں۔(۶۲) اس طرح فیروز الدین کی تمام مدت ملازمت قائم مقامی میں بسر ہوگئی۔

(۱۱)

۲۶ فروری ۱۹۰۴ء کو پروفیسر ٹی ڈبلیو آرنلڈ فلسفے کی پروفیسری سے مستعفی ہو گئے اور ان کی جگہ لالہ جیا رام (Officiating) پروفیسر مقرر ہو گئے۔ جب کرائسٹ کالج کے مسٹر جی۔ایس بریٹ (Brett) فلسفے کے پروفیسر مقرر کیے گئے تو انہوں نے ۱۰ مئی ۱۹۰۴ء کو آ کر چارج لیا۔اس زمانے میں اقبال فلسفے کے اسسٹنٹ پروفیسر ہو گئے تھے۔جب وہ مزید تعلیم کے لیے انگلستان جانے لگے تو تین برس کی تعلیمی رخصت (Study Leave) لی۔۱۴ اکتوبر ۱۹۰۵ء کو ان کی جگہ شیخ نور الٰہی ایم۔اے اسسٹنٹ پروفیسر ہوئے۔اقبال نے یورپ میں تکمیل تعلیم کے بعد اس ملازمت سے استعفیٰ دے دیا اور ۱۹۰۸ء میں شیخ نور الٰہی مستقل اسسٹنٹ پروفیسر مقرر ہو گئے۔مسٹر بریٹ (Brett) صدر شعبہ فلسفہ کم

اکتوبر ۱۹۰۸ء سے ایک برس کی چھٹی پر گئے تو ان کی جگہ سیکرٹری آف سٹیٹ نے مسٹر اے۔ وائٹ جیمز کو (Officiating) پروفیسر مقرر کیا۔ مسٹر وائف جیمز پروفیسر نے اچانک یکم مئی ۱۹۰۹ء کو انتقال کیا۔ اقبال اس زمانے میں بہ طور بیرسٹر کام کر رہے تھے۔ گورنمنٹ کالج کے پرنسپل رابسن (Robsen) نے اقبال کو عارضی پروفیسر فلسفہ کرایا۔ اس منصب کے ساتھ اقبال پریکٹس بھی کرتے رہے۔ کیونکہ انہیں خصوصی مراعات حاصل تھیں۔ اس کی تفصیل سید محسن ترمذی صاحب کے مقالے میں موجود ہے۔ گورنمنٹ کالج کی تاریخ میں ۱۹۰۹ء اور ۱۹۱۱ء کے دو اندراجات قابل ذکر ہیں۔

1909 Dr. Muhammad Iqbal Officiated as Professor of Philosophy.

1911 Mr. R. Sounders Professor of Philosophy in the Deccan College Puna. was appointed Professor of Philosophy and relived Dr.Muhammad Iqbal on the Ist Jan. (page.118)

فلسفے کے اسسٹنٹ پروفیسر کی نئی اسامی پر پربھودت شاستری مقرر ہوئے۔ اقبال پروفیسر کی اسامی سے مستعفی ہو گئے۔ گورنمنٹ کالج کی تاریخ کے صفحہ ۱۵۴ پر اگرچہ ملازمت چھوڑنے کی صراحت نہیں ہے لیکن Revert ہونے کی اطلاع درج ہے۔

Muhammad Iqbal , Assistant Professor of Philasophy M.A. Ph.D 1900(1902)Resigned.Officiating Professor of Philosophy 1910-1911reverted.

(۱۲)

گورنمنٹ کالج سے الگ رہنے کے بعد بھی اقبال کا تعلق پنجاب یونیورسٹی سے قائم رہا۔ انگلستان سے واپسی کے بعد وہ بی اے اور ایم اے فلسفہ کے ممتحن مقرر ہوتے رہے۔ ۱۹۱۷ء میں بی۔اے فارسی کا ایک پرچہ اور ایم۔اے فلسفہ کے دو پرچوں کے بیرونی ممتحن رہے۔

اس کے علاوہ ان کا براہ راست تعلق بھی سینٹ، فیکلٹیوں اور بورڈوں سے رہا۔ وہ ۶ مارچ ۱۹۱۵ء کو پہلی بار حکومت کی طرف سے آرٹ فیکلٹی کے نامزد ممبر مقرر ہوئے۔ (۶۳) ۱۹۱۸ء میں وہ آرٹ فیکلٹی کے علاوہ اورینٹل فیکلٹی کی نمائندگی بھی کرنے لگے، (۶۴) پھر ۱۸ مارچ ۱۹۲۰ء کو ہر دو فیکلٹیوں کی نمائندگی کے لیے وہ سینٹ کے ممبر نامزد ہوئے۔ (۶۵) ۱۷ مارچ ۱۹۲۵ء کو آرٹ کی بجائے صرف

اورینٹل فیکلٹی کے نامزد ممبر بنائے گئے۔ ۱۶ مارچ ۱۹۲۰ء کو بھی ان کے تقرر کا پتا چلتا ہے۔(۶۶)

سینٹ کی ممبری کے علاوہ اقبال ڈین کے فرائض بھی انجام دیتے رہے۔ ۱۹۱۵ء میں وہ ڈین آرٹ فیکلٹی تھے۔(۶۷) ۱۹۱۸ء کو ڈین آف اورینٹل فیکلٹی ہوئے اور یہ سلسلہ ۱۹۳۲ء تک باقاعدہ قائم رہا۔(۶۸)

وہ اکیڈمک کونسل کے رکن بھی تھے، ۱۹۲۵ء۔۱۹۲۴ء میں وہ اکیڈمک کونسل میں گئے۔ وہاں ڈگری ٹیچرز کے نمائندے ہوئے تھے۔(۶۹) یہ سلسلہ ۱۹۲۹ء میں غالباً ختم ہوگیا۔(۷۰)

(۱۳)

وہ بورڈ آف سٹڈیز کے مدتوں ممبر رہے۔ عربی، فارسی، اردو، پشتو بورڈ کی عرصے تک رکنیت چلتی رہی۔ ۱۹۱۸ء میں وہ فلسفے کے بورڈ کے ممبر تھے(۷۱) اور یہ تعلق ۱۹۳۲ء تک قائم رہا۔ اس زمانے میں بورڈ کے کنویئر چیٹر جی ہوا کرتے تھے۔(۷۲) عربی، فارسی، اردو، پشتو کے مشترکہ بورڈ میں علامہ اقبال ۲۳۔۱۹۲۲ء میں شامل ہوئے۔ اس وقت ان کے دوسرے ساتھی ممبر جسٹس عبدالقادر اور میاں شفیع تھے۔ (۷۳) ۱۹۲۴ء۔۱۹۲۳ء میں بھی اقبال شامل تھے اور دوسرے ممبر شیخ عبدالقادر ڈاکٹر صدرالدین، قاضی فضل حق، پروفیسر مترا اور مولوی محمد شفیع تھے۔

اس سال مولوی محمد شفیع بورڈ کے کنوینر ہو گئے۔(۷۴) ۱۹۲۵ء۔۱۹۲۴ء میں اس فہرست میں عبدالقادر کی بجائے ڈاکٹر اقبال پروفیسر اورینٹل کالج اور کالج کے نام کا اضافہ ہوا۔(۷۵) ۳۰۔۱۹۲۹ء میں لالہ چوتھ رام بھی شامل ہوگئے۔(۷۶) آخری زمانے میں اقبال یونیورسٹی کے کاموں سے الگ ہو گئے۔ چنانچہ ۱۱ فروری ۱۹۳۲ء کے ایک خط میں مولوی صالح محمد (ادیب تونسوی) کو لکھتے ہیں:

> ''میرا یونیورسٹی سے اب تعلق نہیں ہے۔ تاہم آپ کا خط میں نے پروفیسر شفیع صاحب کو دے دیا ہے۔ امید ہے وہ آپ کی مدد کر سکیں گے۔ فی الحال آپ اپنے تعلیمی امتیازات (یعنی جو امتحان پاس کیے ہوں) اور موجودہ مشاغل وغیرہ مجھے لکھ بھیجیں۔'' (۷۷)

یہ خط ممتحنی کے بارے میں ہے اور اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس زمانے میں اقبال نہ تو کسی فیکلٹی کے ڈین تھے اور نہ بورڈ آف سٹڈیز کے ممبر ہی ہوں گے۔

اقبال کا اس سلسلے میں آخری بار ذکر ۱۹۳۳ء میں آتا ہے۔ ۴ دسمبر ۱۹۳۳ء کو پنجاب یونیورسٹی نے ان کی ادبی اور علمی خدمات کے اعتراف میں ڈاکٹر آف لٹریچر کی اعزازی ڈگری عطا کی۔(۷۸)

حوالہ جات

۱۔ روز گار فقیر (فقیر سید وحید الدین) طبع چہارم، مئی ۱۹۶۴ء، ص ۲۳۱

۲۔ ایضاً، ص ۲۳۲،۲۳۳

۳۔ ایضاً، ص ۲۲۹

۴۔ ایضاً، ص ۲۲۷

۵۔ Calendar 1896-97 p 348

۶۔ مجلہ اقبال، اکتوبر ۱۹۵۳ء، ص ۶۴ تا ۹۹، مجلہ اقبال، اکتوبر ۱۹۵۵ء، ص ۲ تا ۹۷

۷۔ مجلہ اقبال، اکتوبر ۱۹۵۵ء، ص ۲۸ تا ۶۰

۸۔ Iqbal July 1958 pp.63-71

۹۔ امروز، ۱۵ اگست ۱۹۵۴ء، ص ۴

۱۰۔ پاکستان ٹائمز ۲۲ اپریل ۱۹۵۵ء

۱۱۔ شاد اقبال، ص ۴۴، ۴۵، ۴۶

۱۲۔ پنجاب یونیورسٹی کے یہ کیلنڈر علامہ اقبال کے علاوہ جسٹس شاہدین، غلام بھیک نیرنگ، سر شہاب الدین، شیخ سر عبدالقادر اور بعض دوسرے اکابر کے بارے میں بھی اہم ہیں۔

۱۳۔ Punjab University Calender1896-97

۱۴۔ مجلہ اقبال، اکتوبر ۱۹۵۶ء، مقالہ اقبال اور کشمیر

۱۵۔ Punjab University Calender1895-94-p370

۱۶۔ ایضاً

۱۷۔ ذکر اقبال، ص ۱۵

۱۸۔ Punjab University Calender1896-97

۱۹۔ ذکر اقبال، ص ۱۷

۲۰۔ History of Government College Lahore p.90-91

یہ بیان کہ اقبال نے Bell سے فلسفہ میں استفادہ کیا (مجلہ اقبال اپریل ۱۹۶۲ء) صحیح نہیں، وہ ۱۸۹۵ء کے اوائل میں طویل رخصت پر چلے گئے تھے۔ ۱۸۹۶ء میں واپس آئے تو انہیں انسپکٹر آف سکولز بنایا گیا۔

۲۱۔ Punjab University Calender1896-97, p.372

۲۲۔ A History of the University of the Punjab p.31

یاد رہے کہ گورنمنٹ کالج سے اورینٹل کالج ۱۹۱۲ء میں الگ عمارت میں گیا اور تدریس کا اشتراک بھی ختم ہو گیا۔ ۱۹۱۲ء میں سنسکرت کے اسسٹنٹ پروفیسر گل بہار سنگھ اور عربی کے غلام یزدانی (بعد میں ڈاکٹر غلام یزدانی) اور ۱۹۱۴ء میں ڈاکٹر مولوی صدر الدین مقرر ہوئے فارسی کی پوسٹ اول خالی رہی۔ A History of the University of the Punjab,Lahore, Garrett and Hamid(Ilid p 147)

۲۳۔ A History of Government College Lahore p 95,96

۲۴۔ Calender of Punjab University 1896-97 p 369

۲۵۔ یاد رہے کہ ۱۹۱۲ء میں اورینٹل کالج گورنمنٹ کالج سے جدا ہوا اور اس کے بعد گورنمنٹ کالج نے بی۔اے اور ایف۔اے میں مشرقی زبانوں کی تدریس کا الگ انتظام کیا۔ دیکھئے۔ A History of Government College Lahore p 147

۲۶۔ Ilid 1897-98 p.11

۲۷۔ Statistical Report Oriental College 1898-99, p.7 Para x

۲۸۔ Calendar of the Punjab University 1898-99

۲۹۔ Calendar of the Punjab University 1897-98, p.348

P. 299-333(Report 30 the september 1896)

۳۰۔ P.U. Calendar 1897-98 p.137

۳۱۔ P.U. Calendar 1898-99 pp 336-337

۳۲۔ P.U. Calendar 1914-15(Relenaut Poction)

۳۳۔ A History of Govt. College Lahore pp.112-113

۳۴۔ Ibid . p.93

۳۵۔ A History of Govt College Lahore

۳۶۔ P.U Calendar 1896-97 p.384

۳۷۔ سید محسن ترمذی نے اقبال کی درخواست کے متن سے ۸ دسمبر ۱۸۹۸ء کا سنہ دیا ہے جو صحیح نہیں، اقبال کے حاشیے پر خود ہی تصحیح کر کے ۱۸۹۸ء دیا ہے۔

۳۸۔ P.U. Calendar 1896-97 p 159

۳۹۔ Annual report dated 30th sept 1898

۴۰۔ P.U. Calendar 1899-1900 p.303

۴۱۔ P.U. Calendar 1900-1901 p.273

۴۲۔ P.U. Calendar 1896-97 p 243 and Ibid 1899-1900 p 253

۴۳۔ مجلہ اقبال اپریل ۱۹۶۲ء ص ۵۱ پر اس اسامی کی تنخواہ ۱۰۰ روپے ماہوار ہے اور دس فی صدی کٹوتی کے بعد ۷۲ روپے بتائی گئی ہے۔ یہ رقم اعداد و شمار کی رپورٹ کے مطابق ہے۔ چند پیسوں کے فرق کو حساب سیدھا رکھنے کے لیے پورا دکھایا گیا ہے۔

۴۴۔ P.U. Calendar 1896-97 p 343

۴۵۔ P.U. Calendar 1899-1900 p 301 سے معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے ۱۸۹۴ء میں ایم۔اے عربی کا امتحان اورینٹل کالج سے تھرڈ ڈویژن میں پاس کیا تھا، لیکن اس امتیاز کے ساتھ کہ یونیورسٹی میں اول آئے تھے۔

۴۶۔ مجلہ اقبال اپریل ۱۹۶۲ء ص ۴۸ نیز دیکھئے P.U Calender 1849-1900 p 289 اس کے علاوہ Statistical report on the O.C 1898-99 p 8 کا یہ اقتباس بھی ملاحظہ ہو:

On April 28,1899, Dr. M.A Stein. who for more than eleven peras had been principal of the College, resigned his position to accept the Principalship of the Calcutta Madrasah. Pending the appointment of a success or to the combined post of the Principal of Oriental College and Begistrar of the University the supervision of the College was entrusted to T.W. Arnold, Esq. B.A Professor in the Govt College, for whose valuable servics the sented has since expressed its gratitude. This en-coming Principal entered On his duties on the 24 the Now, The classed formerly janght by the Principal were, after his resignation conducted by paned Durga Datta, Secand Pandit and lala Bhagwan Das M.A Mchead Kashmir

santurd read Professor Arnold having been Designated Delegata of the Unicess to the 12 the International Cngress of Oreientalists held in home in the month of Oct taht Supervision of College during the time that elapsed between the reopening of the College and return, was entrusted to paindit slava Datta M.M.and Mufti mohd Abdullah Statisical report on the O C Nov 1899-1900 P.U.

۱۹۰۰ء میں ڈاکٹر A.W.Strauon پرنسپل ہوئے لیکن اگست ۱۱۰۲ میں ان کا انتقال ہو گیا، پھر آرنلڈ اور بالآخر اپریل ۱۹۰۲ء میں ولنر پرنسپل ہوئے۔

A History of the P.U. J.F Bruce,ed 1933

p.103 also P.U Calendar 1906 p.375

جہاں آرنلڈ کے نومبر ۱۹۰۰ء میں تقرر کی اطلاع درج ہے۔

۴۷۔ P.U. Calendar 1901-1902 p 38 and 378

۴۸۔ Statistical report 1899-1900 PV Para x

۴۹۔ Ibid

۵۰۔ A Bibliography Iqbal(Abdul Ghani and K. Nur Ilabi)Lhr N.D

p.3 نیز اقبالیات کا تنقیدی جائزہ (قاضی احمد میاں اختر) کراچی، ۱۹۵۵ء، ص ۲۵

۵۱۔ Statical reopor 1899-1900, p.13 see also the P.U Calendar 1902-1903 p.364 and also P.U Calendar 1903-4

۵۲۔ Oriental College Annual report 1900-1901 P.U.

Leaw with and pay was granted to M. Mohd Iqbal, M.A Mcleod Arabic reader from the 1st Jan. 1901, Sheikh Feroz-ud-Din B.A and Lala Qudh Karaim B.A, Were afficiante dar him

۵۳۔ P.U. Calendar 1907-1908 p.395

یاد رہے کہ اس سال کی رپورٹ میں اقبال کا کوئی تفصیلی کام درج نہیں ہے۔ ص ۱۹ پر اقبال کی مدت ملازمت ایک سال گیارہ ماہ لیکن حاشیہ میں لکھا ہے۔ رخصت پر ہیں اور شیخ فیروز الدین بی۔ اے ان کی جگہ کام کرتے ہیں۔

۵۴۔ گورنمنٹ کالج کی تاریخ کے مندرجہ ذیل دو اقتباس قابل ذکر ہیں۔

"1902 (A.D)

Shiekh Muhammad Iqbal was reappointed additional Professor of English for six month" Roc. Ct .P 115" 1903 (A D) Sheikh Mhuammad Iqbal was reappointed on the 3rd June " See also P.U Calendar 1902 - 1903 p 395

جہاں ان کا ذکر گورنمنٹ کالج کے سٹاف میں بطور اسسٹنٹ پروفیسر انگریزی ہوا ہے۔

۵۵۔ اورینٹل کالج کی سالانہ رپورٹ (۱۹۰۱ء۔۱۹۰۲ء) مورخہ ۸ جون ۱۹۰۲ء کے مطابق وہ جولائی کے ۱۹۰۱ء کے بعد اپنے عہدے پر واپس آئے۔ مجلہ اقبال ۲ اپریل ۱۹۶۲ء کے مقالہ نگار کا یہ استقلال قابل قبول نہیں کہ

''پرنسپل اورینٹل کالج کی سالانہ رپورٹ بابت ۱۹۰۰ء۔۱۹۰۱ء (مورخہ ۸ جون ۱۹۰۱ء) سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ شیخ محمد اقبال ایم اے میکلوڈ عربک ریڈر کی رخصت بلا تنخواہ کم جنوری ۱۹۰۱ء سے منظور ہوئی اور شیخ فیروز الدین بی۔ اے اور لالہ اودھ نرائن بی۔ اے عارضی طور پر ان کی بجائے اس منصب کے فرائض سرانجام دینے لگے۔ اس رپورٹ سے یہ واضح نہیں ہوتا کہ اقبال نے یہ رخصت بلا تنخواہ کیوں لی۔ کتنے عرصے کے لیے لی اور رخصت لے کر وہ کہاں گئے۔ البتہ اس مسئلہ کا حل گورنمنٹ کالج کی تاریخ یوں پیش کرتی ہے کہ اس عرصے میں شیخ محمد اقبال چھ ماہ کے لیے انگریزی کے ایڈیشنل پروفیسر مقرر کیے گئے لیکن اس حل میں ایک سقم یہ ہے کہ اس تاریخ کے فاضل مولف نے اس اطلاع کا اندراج ۱۹۰۲ء کے ضمن میں کیا ہے اور اس عارضی تقرر کی باقاعدہ تاریخ بھی نہیں دی کہ جس سے صحیح عرصے کا اندازہ لگایا جا سکا۔ تاہم فاضل مولف کے بعض متناقض بیانات سے یہ مترشح ہوتا ہے کہ اس نے صحیح تاریخوں کی چھان بین کی بجائے اندازاً اس اطلاع کو ۱۹۰۱ء کی بجائے ۱۹۰۲ء میں درج کر دیا ہے۔ مثلاً اسی امر کو وہ ضمیمہ (فہرست اساتذہ) میں ۱۹۰۱ء سے ۱۹۰۵ء تک لکھتا ہے اور پھر اس عارضی تقرر (بحیثیت انگریزی استاد) اور مابعد کے تقرر (بحیثیت نائب استاد فلسفہ) میں بھی کوئی مد فاصل قائم نہیں کی گئی اورینٹل کالج کی سالانہ رپورٹ بابت ۱۹۰۱ء۔۱۹۰۲ء (مورخہ ۸ جون ۱۹۰۲ء) سے اس امر کی مزید وضاحت ہو جاتی ہے کہ اس تعلیمی سال میں (یعنی جولائی ۱۹۰۱ء کے بعد) اقبال اپنے اصل منصب (میکلوڈ ریڈر) پر واپس تشریف لے آئے تھے اور اپنے

فرائض منصبی کو باقاعدگی کے ساتھ سرانجام دے رہے تھے۔ مقالہ نگار علامہ اقبال کی اسلامیہ کالج کی ملازمت سے ناواقف ہیں۔ گورنمنٹ کالج کی تاریخ کے اندراجات صحیح ہیں اور ان پر شک کی کوئی وجہ نظر نہیں آتی۔

۵۶۔ Statistical report 1902-1903 p.7

۵۷۔ ایضاً

۵۸۔ Ibid p.14 appendix G

۵۹۔ Statistical reoprt 1902-1903, P.14 appendix G

۶۰۔ Statistical reoprt 1903-1904, P.14 appendix G

۶۱۔ Statistical reoprt 1904-1905, P.14 appendix G

۶۲۔ Statistical reoprt 1905-1906, P.14 appendix G

۶۳۔ P.U Calendar 1920-21 Part I P486

P.U Calendar 1921-22 Part I P485

۶۴۔ P.U Calendar 1922-23 Part I P482

۶۵۔ P.U Calendar 1922-23 Part I P452

P.U Calendar 1924-26 Part I P468,492

۶۶۔ P.U Calendar 1925-26 Part I P492

P.U Calendar 1926-27,28 Part I P308

P.U Calendar 1928-29 Part I P322

P.U Calendar 1929-30 Part I P332

P.U Calendar 1930-31 Part I P345

۶۷۔ P.U Calendar 1917-18 Part I P345

۶۸۔ P.U Calendar 1918-19 Part I P345

P.U Calendar 1919-29 Part I P345

P.U Calendar 1920-21 Part I P345

P.U Calendar 1921-22 Part I P345

P.U Calendar 1922-23 Part I P470

P.U Calendar 1923-24 Part I P470

P.U Calendar 1924-25 Part I P470

P.U Calendar 1925-26 Part I P470

P.U Calendar 1926-27 Part I P326

P.U Calendar 1927-28 Part I P344

P.U Calendar 1928-29 Part I P344

P.U Calendar 1929-30 Part I P355

P.U Calendar 1929-31 Part I P366

۶۹۔ P.U Calendar 1924-25 Part I P451

P.U Calendar 1925-26 Part I P494

P.U Calendar 1927-28 Part I P329

P.U Calendar 1928-29 Part I P329

۷۰۔ P.U Calendar 1929-30 Part I P330

۷۱۔ P.U Calendar 1920-21 Part I P486

۷۲۔ P.U Calendar 1921-22 Part I P485

P.U Calendar 1922-23 Part I P460

P.U Calendar 1923-24 Part I P466

P.U Calendar 1924-25 Part I P483

P.U Calendar 1925-26 Part I P501

P.U Calendar 1926-27 Part I P319

P.U Calendar 1927-28 Part I P336

P.U Calendar 1928-29 Part I P337

P.U Calendar 1929-30 Part I P348

P.U Calendar 1930-31 Part I P357

۷۳۔ P.U. Calendar 1922-23 Part I P461

۷۴۔ P.U. Calendar 1923-24 Part I P467

۷۵۔ P.U Calendar 1924-25 Part I P483

P.U Calendar 1925-26 Part I P501

P.U Calendar 1926-27 Part I P320

P.U Calendar 1927-28 Part I P337

P.U Calendar 1928-29 Part I P338

۷۶۔ P.U Calendar 1929-30 Part I P348

P.U Calendar 1930-31 Part I P357

۷۷۔ اقبال نامہ (شیخ عطاء اللہ) جلد دوم طبع لاہور، ۱۹۵۱ء، صفحہ ۳۹۳، ۳۹۷

۷۸۔ A History of the University of the Punjab J.F.Bruce ed 1933 P220

کتابیات

۱۔ اقبال نامہ، مرتبہ شیخ عطا اللہ حصہ اول، لاہور، س۔ن، حصہ دوم لاہور، ۱۹۵۱ء

۲۔ ذکر اقبال، عبدالمجید سالک، بزم اقبال لاہور، ۱۹۵۵ء

۳۔ روزگار فقیر، فقیر سید وحید الدین، جلد اول، طبع چہارم، کراچی، مئی ۱۹۶۴ء

۴۔ شاد اقبال، مرتبہ ڈاکٹر محی الدین قادری زور، حیدرآباد (دکن) طبع اول

۵۔ اقبالیات کا تنقیدی جائزہ، قاضی احمد میاں اختر جوناگڑھی، اقبال اکیڈمی کراچی، ۱۹۵۵ء

۶۔ A Biblography of Iqbal, Abdul Ghani K. Nur Ilahi. Lahore, n.d.

۷۔ A History of Government Colledge Lahore, 1894-1964, H.L.O Garret B-Abdul Hamid, Lahore 1964

۸۔ A History of Govt. College Lahore, 1864-1964, H.L.O. Garret, Lahore 1914

۹۔ A History of University of the Punjab J.F.Bruce, Lahore 1933.

۱۰۔ Statiscal Report on the Oriental College 1897-98

۱۱۔ Statiscal Report on the Oriental College 1898-99

۱۲۔ Statiscal Report on the Oriental College 1899-1900

۱۳۔ Statiscal Report on the Oriental College 1900-1901

۱۴۔ Statiscal Report on the Oriental College 1901-1902

۱۵۔ Statiscal Report on the Oriental College 1902-1903

۱۶۔ Statiscal Report on the Oriental College 1903-1904

۱۷۔ Statiscal Report on the Oriental College 1904-1905

۱۸۔ The Punjab University Calendar 1894-95

۱۹۔ The Punjab University Calendar 1896-97

۲۰۔ The Punjab University Calendar 1897-98

۲۱۔ The Punjab University Calendar 1898-99

۲۲۔ The Punjab University Calendar 1899-1900

۲۳۔ The Punjab University Calendar 1900-1901

۲۴۔ The Punjab University Calendar 1901-1902

۲۵۔ The Punjab University Calendar 1902-1903

۲۶۔ The Punjab University Calendar 1903-1904

۲۷۔ The Punjab University Calendar 1906-1907

۲۸۔ The Punjab University Calendar 1907-1908

۲۹۔ The Punjab University Calendar 1914-1915

۳۰۔ The Punjab University Calendar 1920-1921

۳۱۔ The Punjab University Calendar 1921-1922

۳۲۔ The Punjab University Calendar 1922-1923

۳۳۔ The Punjab University Calendar 1923-1924

۳۴۔ The Punjab University Calendar 1924-1925

۳۵۔ The Punjab University Calendar 1925-1926

۳۶۔ The Punjab University Calendar 1925-1926

۳۷۔ The Punjab University Calendar 1925-1926

۳۸۔ The Punjab University Calendar 1928-1929

۳۹۔ The Punjab University Calendar 1929-1930

۴۰۔ The Punjab University Calendar 1930-1931

۴۱۔ The Punjab University Calendar 1931-1932

۴۲۔ امروز (روزنامہ) اقبال کا تعلیمی سفر (عبداللہ قریشی) لاہور۔ ۱۵۔ اگست ۱۹۵۴ء

۴۳۔ مجلہ اقبال، حیات اقبال کی گم شدہ کڑیاں (محمد عبداللہ قریشی) جلد۲، شمارہ۲، اکتوبر ۱۹۵۳ء

۴۴۔ اقبال اور کشمیر (محمد عبداللہ قریشی) جلد۵، شمارہ۲، اکتوبر ۱۹۵۳ء

۴۵۔ حیات اقبال کی گم شدہ کڑیاں (محمد عبداللہ قریشی) جلد نمبر۴، شمارہ۲، اکتوبر ۱۹۵۷ء

۴۶۔ اقبال اور اورینٹل کالج (غلام حسین ذوالفقار) جلد۱۰، [illegible]، اپریل ۱۹۶۲ء

۴۷۔ مجلہ فکر و نظر، علامہ اقبال کی زندگی کی بعض تفصیلات (وحید قریشی) جلد۱، شمارہ۱، مارچ ۱۹۶۲ء

۴۸۔ Iqbal Review (Journal) Date of Iqbal's birth (S.A.Valid) Karachi Vol, V No.3, Oct, 1964

Iqbal (Journal) Some Aspects of Iqbal's Biography -۴۹
(Abdullah Qureshi) LHR July 1958

Pakistan Times (Daily) (Sayyid Mobin Tirmizi) Lahore, -۵۰
22nd April 1955

پاکستان میں اردو تحقیق کے دس سال

(۱۹۵۸ء۔۱۹۶۸ء)

(۱)

اردو میں ادبی تحقیق کا آغاز یوں تو دور سرسید سے ہوتا ہے۔ حالی، شبلی، آزاد اور سرسید کے ہاں تصحیح متن اور مقالات میں تحقیقی شعور کی کچھ جھلکیاں ملتی ہیں لیکن باقاعدہ طور پر اردو تحقیق کی روایت پہلی جنگ عظیم سے شروع ہوتی ہے۔ ڈاکٹر زور، عبدالسلام ندوی، سید سلیمان ندوی، مولانا عبدالحی، ڈاکٹر عبدالستار صدیقی، ڈاکٹر مولوی عبدالحق، حافظ محمود شیرانی، پروفیسر محمد اقبال اور ڈاکٹر مولوی محمد شفیع کے نام اس سلسلے میں خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ ان سے قبل مشرقی علوم میں تحقیق کی روایت بہت کچھ ایشیاٹک سوسائٹی کلکتہ کے ہاتھوں مضبوط اور مستحکم ہو چکی تھی اور یہی لسانی اور تصحیح متن کی روایت پاک و ہند کی یونی ورسٹیوں میں پھنے پھولنے لگی تھی۔ اردو ادب کی تحقیق و تدقیق بھی اسی تحقیقی روایت کا حصہ ہے۔ جن بزرگوں کے نام ابھی اوپر لیے گئے ہیں، ان میں سے بیشتر کے علمی کارنامے اردو ادب کی حدود سے نکل کر عربی اور فارسی کے ذخیرے تک جاتے ہیں۔ متنوں کی ترتیب و تصحیح، تاریخ ادب کے غیر معلوم گوشوں کی دریافت، زبان کے آغاز و ارتقاء کی نشان دہی اور شعرا و ادبا کے حالات زندگی کی تعین کے علاوہ ان علوم کی بازیافت ان لوگوں کا حصہ خاص ہے جو مسلمانوں کے علوم اور مسلمانوں کے معاشرے سے تعلق رکھتے ہیں۔ ایشیاٹک سوسائٹی کی روایت کے زیر اثر یہ ادبا فلالوجی کے اصولوں اور زبانوں کی شجرہ بندی کا بہت شوق رکھتے ہیں۔ اس سے ہٹ کر ادب کو تاریخ کے تناظر میں دیکھنے کا احساس بھی محققین کی تحریروں میں نمایاں ہے۔ اس سے ہماری تاریخ ادب کی تدوین کا کام بہت کچھ آسان ہو گیا ہے لیکن تحقیق کو حقائق کی صحت سے آگے ان کی تاویل و تشریح اور فلسفیانہ توجیہہ تک لے جانے میں ان صاحبوں نے زیادہ توجہ نہیں کی۔

اس کا فوری اثر یہ ہوا کہ آئندہ کے لیے تحقیق اور تنقید الگ الگ خانوں میں بٹ گئی اور اردو ادب میں تنقید، تحقیق سے ایک بڑی حد تک بے نیاز ہو کر چلنے لگی۔ اس سلسلے میں انفرادی تلاش و جستجو کے علاوہ دبستانی سطح پر جو کام ہوا ہے، اس کے بڑے بڑے مرکز حیدر آباد دکن، اعظم گڑھ اور لاہور قرار دیئے

جاسکتے ہیں۔ تحقیقی اصولوں کے استعمال میں ان دبستانوں کے نظریات میں بین فرق ہے۔ دکنی محققین تصحیح متن میں قلمی نسخوں کے اختلاف کو زیادہ اہمیت نہیں دیتے اور نظری مباحث میں بھی واقعات کی صحت کا دار و مدار زیادہ تر ادبی کتابوں پر رکھتے ہیں اور تاریخ سے حاصل ہونے والی معلومات کو ادبی مواد سے پوری طرح ہم آہنگ نہیں کرتے۔ تاہم اس سے دکنیات کا ایک بڑا ذخیرہ ہمارے سامنے آ گیا۔ لسانی لحاظ سے دوسرے دبستانوں پر دکن کو یہ فوقیت حاصل ہے کہ وہاں کے محققین زبان کے آغاز و ارتقا کے مسائل میں زبان کو فلالوجی کی حدوں سے نکال کر صوتیات کی منزل میں لے آئے۔ یہی توانا روایت دوسرے علاقوں کے محققین کو متاثر کیے بغیر نہ رہ سکی۔ چنانچہ ڈاکٹر عبدالستار صدیقی، ڈاکٹر شوکت سبزواری اور ڈاکٹر مسعود حسین خاں سے لے کر دور حاضر میں ڈاکٹر گوپی چند نارنگ تک یہ صوتیاتی شعور ایک مستقل اور سائنٹفک علم کی حیثیت اختیار کر گیا ہے۔ تحقیق کا دوسرا دبستان جس کا مرکز اعظم گڑھ ہے۔ اس لحاظ سے دکنی دبستان سے مختلف ہے کہ وہاں اردو کو صرف زبان کی حیثیت سے نہیں بلکہ مسلمانوں کی علمی زبان کے طور پر دیکھنے کی کوشش کی گئی اور اس صورت حال کا علمی جائزہ مذہبی رجحانات اور مذہبی علوم کی روشنی میں لیا گیا۔ علامہ شبلی کی مورخانہ روایت ان لوگوں کے لیے بنیادی اہمیت رکھتی ہے۔ متن کی ترتیب و تصحیح کو زیادہ اہمیت نہیں دی گئی۔ اس کے مقابلے میں اردو ادب کے بنیادی مسائل کو تاریخ کی کسوٹی پر پرکھا گیا۔

تیسرا لاہور یا اورینٹل کالج لاہور کا دبستان ہے۔ یہ محققین مختلف علوم کے مطالعے کو زبانوں کے مطالعے کے لیے ضروری قرار دیتے ہیں۔ اسی لیے انہوں نے ادب کو معاشرتی علوم کے حوالے سے دیکھنے کی سعی کی، خصوصاً تاریخ کو ان کے نظام تحقیق میں بنیادی حیثیت حاصل ہے۔ یہ لوگ بنیادی طور پر محققین ہیں اور ادب سے حاصل کردہ واقعات اور سنین کو تاریخ کی کسوٹی پر پرکھتے ہیں۔ اردو تحقیق کی روایت میں انہوں نے احتیاط کا اعلیٰ معیار قائم کیا۔ تحقیق میں سہل نگاری اور حوالے کی بے احتیاطی کا محاسبہ سختی سے کیا گیا۔ تحقیقی مسائل میں ان محققین کا کارنامہ خاص یہ ہے کہ اردو تحقیق کی مخصوص زبان وضع کرنے کے علاوہ ان بزرگوں نے تحقیقی مقالات میں اسلوب کی اہمیت پر بہت زیادہ اصرار کیا اور کھرے کھوٹے کی تمیز میں بے رحمی اور بے لحاظی کے عناصر کو ضروری گردانا۔ بنیادی اور ثانوی مآخذ کے درمیان امتیاز، دلائل کی مختلف کڑیوں کی پوری چھان بین، نسخوں کی قدامت کا تعین، رسم الخط کے عہد بہ عہد تغیرات کا احساس اور املا کے خصائص کے ادراک کے علاوہ حوالوں کے اندراج میں اخلاقی قدروں پر سختی سے عمل اس دبستان کی خصوصیات ہیں۔

بیسویں صدی کے تیسرے دہ سالے میں ان مذکورہ دبستانوں کے علاوہ رام پور اور پٹنہ کے دبستان بھی ہمارے سامنے آتے ہیں۔ پٹنہ کے دبستان میں قاضی عبدالودود، ڈاکٹر [illegible] اور نیوی، ڈاکٹر مختار

الدین آرزو کے علاوہ ایک خاصا بڑا گروہ ہمارے سامنے آتا ہے ان میں قاضی عبدالودود سرخیل کی حیثیت رکھتے ہیں اور ان ہی کے اصولوں اور قواعد کی پابندی باقی محققین کے ہاں نظر آتی ہے۔ قاضی صاحب نے ثانوی مآخذ سے بالعموم صرف نظر کیا اور اپنی تحقیق و تدقیق کو معاصر مواد ب تک محدود کر دیا۔ حوالے میں احتیاط کا عنصر قاضی صاحب کے ہاں بہت ہے۔ دبستان لاہور کے مقابلے میں اس دبستان میں ایک کمی البتہ یہ نظر آتی ہے کہ مخففات کے لیے دریغ استعمال سے تحریر کی روانی اور اسلوب کا حسن ماند بڑ گیا ہے۔ معاصر مواد سے مناسب حد تک نتائج اخذ کر کے حوالوں کی اپنی تحریر کا لازمی حصہ بنانے کا طریقہ ترک ہو گیا ہے اور مواد کو خام صورت میں قارئین تک پہنچانے پر اکتفا کیا گیا ہے ترتیب متن میں البتہ ان محققین نے بہت کام کیا ہے اور متن میں جو معیار پٹنہ کی تصانیف میں ملتا ہے، وہ لاہور کے دبستان کی تصانیف سے کسی طرح کم نہیں ہے۔

رام پور کے دبستان میں مولانا امتیاز علی صاحب عرشی کی ذات گرامی میں بہت اہمیت رکھتی ہے۔ عرشی صاحب نے متن کی تصحیح میں جو محنت اٹھائی ہے اس کے قابل قدر نمونے مکاتیب غالب، سلک گوہر اور دستور الفصاحت ہیں۔ دستور الفصاحت کی ترتیب اور تحشیے میں تذکروں کی ترتیب کا ایک نیا اسلوب نکالا گیا ہے۔ جس سے حواشی اصل کتاب کے علاوہ معلومات کا ایک بڑا گنجینہ بن گئے ہیں۔

(۲)

تقسیم برصغیر کے بعد اردو تحقیق اور تنقید کا سلسلہ ابتدائی چند برس میں ایک بڑی حد تک منتشر ہو گیا۔ سیاسی حالات اور آبادی کے نقل مکانی نے پاکستان اور بھارت دونوں جگہ سیاسی اور سماجی سطح پر کئی تبدیلیاں پیدا کیں۔ تحقیق ایک صبر آزما عمل ہے اس میں جن سہولتوں اور مواد کے ذخیروں کی ضرورت ہے وہ تاریخ کے ایسے دور میں میسر نہ تھی، جب کہ ایک طرف مہاجرین کی بحالی اور دوسری طرف نوزائیدہ مملکت کی بقا کے مسائل درپیش تھے۔ ذہنی سکون کے رخصت ہو جانے سے وہ فرصت اور عوامی تگ و دو میں وہ انہماک باقی نہ رہا جو کسی اعلیٰ پایے کے علمی کام کے لیے ضروری ہے۔ ۱۹۴۹ء سے لے کر ۱۹۵۸ء تک ملک کی سیاسی حالت مسلسل اور متواتر بحران کا شکار رہی۔ حکومت اعلیٰ پیمانے پر تعلیمی منصوبہ بندی نہ کر پائی۔ اگرچہ انفرادی طور پر پاکستان میں تحقیق کی روایت کسی نہ کسی طرح زندہ رہی اور حکومت بھی بعض اداروں کی تشکیل اور مالی اعانت کسی نہ کسی حد تک کرتی رہی لیکن اعلیٰ تحقیقی کام کے لیے فضا تیار نہ ہو سکی۔ آخر کار پہلے پنج سالہ منصوبے میں جو ۱۹۵۵ء سے ۱۹۶۰ء تک کے دور کو حاوی تھا، مختلف تعلیمی مدارج میں تحقیق کی اہمیت کو پیش نظر رکھا گیا۔ اس منصوبے کے خالقین نے واشگاف الفاظ میں اس بات

کا اقرار کیا کہ یونیورسٹی کی سطح پر تحقیقی کام کی تشکیل نو از حد ضروری ہے۔ ساتھ ہی ساتھ اس بات کا اقرار بھی کیا گیا کہ ہمارے ملک میں ابھی تحقیق کا وہ شعور پیدا نہیں ہوا جو علم اور حصول کو انقلاب آفرین بنا سکے۔

پاکستان میں تحقیقی کام کی رفتار ست رہی ہے۔ بھارت میں اردو دشمنی کی قومی لہر اور حکومت کی معاندانہ روش کے باوجود اردو تحقیق میں جس معیار کا کام ہوا ہے، ہمارے علمی سرمائے میں اس کی اہمیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ سبب شاید یہ ہے کہ وہاں اردو اور زبن کی خدمت کا جذبہ ایک سرفروشانہ اور مجاہدانہ انہماک کا نتیجہ ہے۔ وہاں اردو کے محققین وادبا کو اندازہ ہو چکا ہے کہ اردو زبان کے بقا و تحفظ کا مسئلہ خود ان کی مرگ و حیات کا مسئلہ ہے اس احساس کے تحت وہاں علمی سرگرمی کی روز یادہ موثر اور متحرک ہے۔ دوسرے بھارتی محققین کو علمی ذخائر کی جو سہولتیں میسر ہیں ان کا سامان نوزائیدہ مملکت میں فی الحال ممکن ہی نہیں۔ ادبی تحقیق اعلیٰ سرمائے اور عمدہ لائبریوں کے بغیر مشکل ہے۔ پاکستان میں تحقیق کے میدان میں پس ماندگی کے اسباب میں اس مذکورہ سبب کا احساس ہماری حکومت کو بھی ہے۔ وہ اپنے وسائل کا ایک اہم حصہ تحقیق و تدقیق کے لیے وقف کر رہی ہے۔ پاکستان کی یونی ورسٹیوں میں، اعلیٰ تعلیم کے علاوہ تحقیق کے بھی مراکز ہیں۔ ہر سال کم و بیش ۳۰ لاکھ روپے کی مالی امداد صرف تحقیقی وسائل پر صرف ہو رہی ہے اور اس رقم ایک حصہ ان منصوبوں کے لیے وقف ہے جو بالواسطہ یا بلا واسطہ اردو زبان و ادب سے متعلق ہیں۔ علاوہ ازیں اردو زبان و ادب کے لیے حکومت ہر سال کم و بیش سولہ لاکھ روپے مختلف اداروں کی تحویل میں دیتی ہے۔ اس سے ہمارے ہاں تحقیقی کام کی اہمیت کا کچھ قیاس کیا جا سکتا ہے۔

(۳)

اس مرحلے پر لازماً یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ حکومت کی اس امداد کے باوجود آخر ہمارے ہاں تحقیق کا معیار کیوں بلند نہیں ہو رہا؟ اس کے کچھ بنیادی اسلوب ہیں۔

پاکستان ایسا زرعی ملک ہے جو زرعی مدارج سے ترقی کرتے ہوئے صنعتی دور میں داخل ہو رہا ہے۔ نوزائیدہ مملکت کی حیثیت سے بھی اسے کئی دشواریوں کا سامنا ہے۔ ستمبر ۱۹۶۵ء میں تو اسے اپنی بقا کے لیے اپنی تمام ملکی و ملی وسائل کو بروئے کار لانا پڑا۔ ایسے میں جہاں اپنی بقا کا مسئلہ دیگر مسائل پر فوقیت رکھتا ہو اور قوم کا ہر فرد مادی اور منفعت بخش پیشوں کی تلاش میں سرگرداں ہو جہاں قومی فلاح و بہبود کے تقاضے صنعتی اور مشینی معاملات پر منحصر ہو جائیں، وہاں ان ادبی مشاغل کی اہمیت برقرار نہیں رہ سکتی جو فوری طور پر سرمایہ کاری اور دولت اندوزی کا ذریعہ نہ ہوں۔ نئے صنعتی دور کے زیر اثر وجود میں آنے

والا نیا طبقہ علوم وفنون کے تفریحی پہلوؤں کا محافظ تو ہو سکتا ہے لیکن اس سے سنجیدہ تحقیقی معاملات اور تہذیبی علمی سرمائے کی حفاظت کی توقع نہیں کی جا سکتی۔ حکومت کی بیش از بیش توجہ اور تحقیق کے لیے رقوم کی فراہمی کے باوجود مادی ترقی کی دوڑ میں وہی علوم وفنون پنپ سکتے ہیں جن سے کاروباری اور تجارتی مفادات وابستہ ہو سکیں، اور ظاہر ہے تحقیق ادب ان فادی پہلوؤں سے ایک بڑی حد تک خالی ہے۔ تقسیم برصغیر کے وقت ہمارا علمی سرمایہ بھارت کی لائبریریوں میں رہ گیا۔ انڈیا آفس کی کتابوں کا مسئلہ ہنوز حل طلب ہے۔ تشکیل پاکستان کے وقت لے دے کر ہمارے پاس ڈھاکہ یونیورسٹی، پنجاب یونیورسٹی کی لائبریروں کے علاوہ پنجاب پبلک لائبریری لاہور، پشاور آرکایوز اور لاہور کا ریکارڈ آفس تھے۔ حکومت نے نئی نئی یونی ورسٹیوں کے قیام کے ساتھ ساتھ ان اداروں میں کتاب خانوں کی داغ بیل ڈالی۔ پھر کراچی کا قومی عجائب گھر ہمارے تہذیبی ورثے کا ایک اہم مرکز ہوا جس کی لائبریری آج اپنے مخطوطات کے سرمائے کے لحاظ سے پنجاب یونیورسٹی کے دوش بدوش پہنچ چکی ہے اس کے علاوہ حکومت کی امداد سے قائم ہونے والے ادارے اور اکیڈمیاں بھی کتابوں کی جمع آوری میں مصروف ہیں: لیکن ہمارا یہ علمی سرمایہ فی الحال ان ذخائر کا مقابلہ نہیں کر سکتا جو بھارت اور انگلستان میں پڑے ہیں۔ محققین کو پاکستان میں موجود کتب خانوں سے استفادے کے پورے وسائل بھی میسر نہیں۔ نتیجہ یہ ہے کہ ایک تو یہ سرمایہ ہی قلیل ہے، دوسرے مختلف اداروں میں باہمی تعاون کی کمی کے سبب کتابوں سے استفادہ بھی آسان نہیں۔ اعلیٰ پائے کی تحقیق کے لیے جن چیزوں کی ضرورت ہے ان میں مواد کی فراہمی، فرصت اطمینان اور مناسب مالی حوصلہ افزائی کو بہت اہمیت حاصل ہے۔ ایک نوزائدہ مملکت میں، جہاں قوم کا ہر فرد جاب منفعت کی دوڑ میں مصروف ہو، اس فرصت اور اطمینان قلب کا میسر آنا ممکن نہیں جو تحقیق کے لیے ضروری ہے پھر ایک قباحت یہ بھی ہے کہ صنعتی ترقی کے بخار میں مبتلا معاشرہ، علمی کاموں کو بھی کاروباری پیمانوں سے جانچتا ہے۔ تحقیقی کام کی رفتار کا اندازہ بھی مشینی ترازو میں کیا جائے تو پھر تحقیق میں معیار کا مسئلہ کڈھب ہو جاتا ہے۔ ہمارے ہاں یہ رجحان عام ہے کہ ہر تحقیق کا نتیجہ فوری طور پر دیکھنا چاہتے ہیں۔ شکر کے کارخانے جس طرح اپنی پیداوار (Production) کا عملی ثبوت مہیا کرتے ہیں اور ہر سال جنس کے انبار لگا کر اپنی افادیت ثابت کرتے ہیں اسی طرح تحقیق ادب میں بھی ہم معیار کے مقابلے میں مقدار کے پیچھے پڑے ہوئے ہیں۔ اس کی ادنیٰ سی مثال اردو انسائیکلو پیڈیا آف اسلام، تاریخ ادبیات اور اردو لغت جیسے عظیم منصوبے ہیں۔ ان اہم منصوبوں میں بھی ہم فوری نتیجے کی آس لگائے بیٹھے ہیں۔ ہم یہ بھول جاتے ہیں کہ تحقیق الہ دین کا چراغ نہیں کہ اسے گھسا کر فوراً مطلب کی چیز برآمد کر لی جائے۔ اس صورت حال کا فوری اثر یہ ہے کہ مختلف علمی اداروں کو اپنے بچاؤ کے لیے خاصا وقت صرف کرنا پڑتا ہے جو بہ صورت دیگر وہ اپنے علمی کام پر صرف کرتے۔ دوسرے اپنے مال کو

''بازار میں لگا کر'' دوسروں پر سبقت لے جانے کی خواہش میں محققین'' کا تا اور لے دوڑی'' پر عمل کر کے تحقیق کے معیار کو پست سے پست تر کر بیٹھتے ہیں۔ جو محققین اس تیز رفتاری کا ساتھ نہیں دیتے اور معیار کے پیچھے جاتے ہیں۔ ان کے لیے علمی کام کے راستے مسدود ہونے کے امکانات بڑھتے ہیں۔ تحقیق سے رفتہ رفتہ جاں کاوی اور محنت کا عنصر خارج ہونے لگا ہے اور یہ کوئی خوش آیند بات نہیں ہے۔

(۴)

صنعت کاری کی عمومی رو نے جہاں دوسرے ممالک میں اخلاقی قدروں کی شکست وریخت کی ہے، وہاں پاکستان بھی اس کی زد میں نہیں بچ سکا۔ اقدار کی شکست کا یہ عمل شعر وادب کو بھی متاثر کیے بغیر نہیں رہ سکا۔ محنت سے جی چراتے ہوئے، آسان راستوں کی تلاش ہماری تحقیقی وادبی کارناموں میں واضح نقش چھوڑ رہی ہے۔ اس سہل انگاری کے کئی مظاہر ہیں:

(الف) حوالوں میں جعل سازی، یعنی متاخر کتب سے مواد لے کر معاصر کتب کا حوالہ درج کرنے کی رسم۔

(ب) حوالوں کو قلم بند کرنے میں بے احتیاطی

(ج) دوسروں کے کیے ہوئے علمی کام کو معمولی ردوبدل سے (بغیر حوالے کے) اپنے ہاں سمو لینے کا رواج۔

(د) کتابیات کی ترتیب میں سائنٹفک طریق کار سے غفلت۔

(ہ) متن کی تصحیح میں عدم احتیاط، غیر معیاری نسخوں کو بنیادی نسخے قرار دینے کی غلطی، اختلاف نسخ کے قلم بند کرنے میں بے احتیاطی، پورے علمی ذخیرے کو سامنے رکھ کر کام شروع کرنے کی بجائے ناقص ذرائع پر بھروسہ، چھپائی اور پروف ریڈنگ میں غفلت۔

(۵)

ان خامیوں کے علاوہ اخلاقی قدروں سے صرف نظر کرنے کی وجہ سے بعض غلط رجحان بھی ہمارے ہاں فروغ پا رہے ہیں۔ ان میں دو کا ذکر ضروری ہے:

اول یہ کہ پاک و ہند کے مختلف ادارے اور یونیورسٹیاں تقسیم کار کے اصول پر عمل پیرا نہیں۔ دس دس

جگہ ایک ہی موضوع پر کام ہو رہا ہے۔ محقق ایک دوسرے پر سبقت لے جانے کی خواہش میں ناقص اور ادھورا کام چھاپ کر مارکیٹ میں لانا یا پھر ٹائپ کر کے ڈگری کے لیے پیش کرنے میں کوشاں نظر آتا ہے۔

پاک و ہند میں تحقیقی کام کرنے والے گنے چنے لوگ ہیں۔ اگر وہ بھی یہ غیر علمی طریقہ اختیار کرتے ہوئے اپنے آپ کو صرف چند موضوعات میں محصور کر لیں تو پھر یہ تاریخ ادب کے غیر واضح گوشے اور مبہم حصے تحقیق کے محتاج ہی رہ جائیں گے۔ اس میں کچھ برائی نہیں کہ جس موضوع پر معیار کام نہیں ہوا، اس پر کوئی دوسرا محقق قلم اٹھا کر مواد کا اضافہ اور تاویل و توضیح کے بہتر نمونے پیش کرنے اور اپنے پیش رو کی غلطیوں کی نشان دہی کر دے۔ یہ طریق کار بہت ضروری بھی ہے۔ لیکن بعد میں شائع ہونے والی تحقیقی کام میں اگر پیش رو کے مقالے کی خامیاں اسی طرح برقرار رہیں یا ان میں دس بیس کا اضافہ ہو جائے تو پھر ایک دوسرے کے موضوع کو چھینا جھپٹی کا یہ عمل کسی طرح بھی قابل ستائش نہیں ہے۔

دوم یہ کہ مختلف ادارے اور یونی ورسٹیاں اپنے ہاں ہونیوالے تحقیقی کام کی مناسب رہنمائی اور باقاعدہ چھان بین نہیں کرتے۔ نو عمر محقق جلد سے جلد ڈگری حاصل کرنے کی آرزو میں اور فوری طور پر مصنف بن جانے کی تمنا میں کام پر مناسب توجہ نہیں کرتے۔ ایسے میں ہوتا یہ ہے کہ پیش رؤں کے مال پر ہاتھ صاف کر لیا جاتا ہے۔

صورت حال کا اندازہ اس بات سے بہ خوبی لگایا جا سکتا ہے کہ سرشار پر اس وقت آگرہ یونی ورسٹی، الہ آباد یونی ورسٹی، لکھنو یونی ورسٹی، پنجاب یونیورسٹی اور لندن یونیورسٹی میں مقالے لکھے جا رہے ہیں۔ پریم چند پر پنجاب، علی گڑھ اور سری نگر میں بیک وقت کام ہوا اور ڈگریاں بھی ملیں۔ طنز و مزاح پر پنجاب کے بعد لکھنو اور بمبئی میں تحقیقی کام ہوا۔ رسوا پر علی گڑھ، بمبئی اور پنجاب میں ڈگریاں دی گئیں۔ اردو ادب کے سیاسی اور سماجی پہلو اور پنجاب اور سندھ میں قائم پر، علی گڑھ اور کراچی میں کام ہو رہا ہے۔ آزاد پر پنجاب سے اور اس کے بعد کراچی سے کام ہوا ہے۔ میر حسن پر پنجاب سے کام ہوا اور چھپ گیا، اب کراچی یونیورسٹی اور پٹنہ میں بھی جاری ہے۔ یونی ورسٹیوں کے علاوہ ادارے بھی اس دوڑ میں مصروف ہیں۔ گلشن ہند از چندر بخش حیدری کے متن کی اشاعت ڈاکٹر مختار الدین آرزو، ڈاکٹر اقتدار حسن اور ڈاکٹر عبادت بریلوی نے اپنے اپنے ذمے لی۔ آرزو کا متن آ چکا ہے اور دوسرے ابھی مصروف ہیں۔ ''کربل کتھا'' پر ڈاکٹر آرزو نے کام شروع کیا، اس کی خبر اہل دہلی کو بھی ہو گئی، چنانچہ دہلی یونیورسٹی کا متن فوراً چھپ گیا، پھر مالک رام اور آرزو نے بھی اپنا متن شائع کر دیا۔ مصحفی کے کلمات کی اشاعت کے سلسلے میں نثار احمد فاروقی اور نور الحسن نقوی کے درمیان دوڑ جاری ہے۔ نقوی نے دیوان مصحفی کی جلد اول دلی سے شائع کی، فاروقی جلد دوم چھاپ کر مارکیٹ میں لے آئے۔ مصحفی کے آٹھ دیوان ہیں، دیکھیے یہ

معرکہ کب تک جاری رہتا ہے۔ لاہور سے دیوان زادے کا انتخاب چھپا اور فاضل مرتب پورا دیوان زادہ مرتب کر رہے تھے کہ یہی سلسلہ رام پور سے شروع ہوگیا۔ اب دونوں زادے گھوڑ دوڑ کے میدان میں اتر چکے ہیں۔

علمی اور ادبی معاملات میں اس طرح کی تنگ نظری کسی اچھے معیار کا پیش خیمہ نہیں ہوسکتی۔ اس کا ثبوت یہ بھی ہے کہ اب تک کی باہمی آویزش سے جو سرمایہ علمی سامنے آیا، اس کا زیادہ حصہ ناقص اور بے ہودہ ہے، کیوں کہ بعض محققین گوسبقت لے جانے کی تگ ودو میں موضوع سے انصاف نہیں کر پاتے اور بعض کے دوسروں کی محنت کو بغیر حوالے کے اپنے ہاں سمو کر اخلاقی دیانت داری کا ثبوت نہیں دیا۔ اردو تحقیق کے لیے یہ صورت حال بہت تشویش ناک ہے۔

(۶)

ہماری معاشرتی زندگی کا ایک رجحان بھی تحقیق کے لیے آزمائش کا حکم رکھتا ہے۔ اردو میں تحقیق کی روایت پہلی جنگ عظیم کے بعد تنقید سے الگ ہوگئی۔ ابتدائی محققوں نے حقائق کی جمع آوری اور واقعات کی صحت کا خیال تو رکھا لیکن حقائق کی تعبیر و تاویل اور فلسفیانہ توجیہہ سے دامن کش رہے۔ تاریخ ادب کے لیے وہ خام مواد مہیا کر کے مطمئن ہوگئے اور ادب کے تخلیقی عمل اور تنقیدی شعور سے کنارہ کش رہے۔ نقادوں نے تحقیق کو تنقید کے مقابلے میں گھٹیا ذہنی عمل گردانا اور تحقیق و تنقید کے فاصلے بڑھتے چلے گئے۔ تقسیم برصغیر کے بعد تنقید کو تحقیق کا دشمن قرار دے کر نقادوں نے پر حقارت رویہ اپنالیا۔ اس مغایرت اور نفرت آمیز رویئے نے تحقیق کے لیے تنقید کی اور تنقید کے لیے تحقیق کی ضرورت کا ادراک نہ ہونے دیا۔ محقق گلی سڑی ہڈیوں کے تاجر قرار پائے اور سماجی مرتبے کے سنگھاسن اور صرف تنقید کو جگہ ملی۔ اسی افراتفری نے اردو ادب کے بعض اہم محقق کھودیے۔ بعض نے تحقیق سے توبہ کر کے تنقید کو اپنالیا کیوں کہ تنقید کی مارکیٹ زیادہ بلند سماجی رتبے کی ضامن تھی۔

گزشتہ بیس برس کے تحقیقی سرمائے کو نظر غائر سے دیکھا جائے تو اس میں ست روی کے باوجود ایک حصہ ایسا ضرور ہے جسے قابل اعتماد قرار دیا جاسکتا ہے۔ حکومت کی طرف سے تحقیق کے معیار کو بلند کرنے اور سہولت بہم پہنچانے کی کوششیں برابر جاری ہیں۔ پاکستان کے وجود میں آنے کے بعد بعض ادارے قائم کیے گئے۔ ۱۹۵۸ء سے لے کر ۱۹۶۸ء تک کئی نئے ادارے اور نئے منصوبے اس میں شامل کیے گئے۔ انجمن ترقی اردو کراچی، پاکستان ہسٹاریکل سوسائٹی، اقبال اکیڈمی، مسلم ایجوکیشن کانفرنس، سندھی ادبی بورڈ، ترقی اردو بورڈ کراچی۔ (اردو ڈکشنری بورڈ) اردو اکیڈمی بہاول پور، اردو اکیڈمی لاہور، مرکزی

اردو بورڈ لاہور۔ (اردو سائنس بورڈ)، بزم ثقافت لاہور، بزم اقبال لاہور، مجلس ترقی ادب لاہور، پنجابی اکیڈمی لاہور، پشتو اکیڈمی پشاور، وہ چند ادارے ہیں جو مختلف مرحلوں میں حکومت کی مالی مدد سے ادب و فن کی خدمت کر رہے ہیں۔ ان میں بیشتر نے اپنی توجہ اردو تحقیق پر صرف کی۔ جتنا تحقیقی سرمایہ اس سرکاری مدد سے میسر ہوا ہے، قابل لحاظ ہے۔ ظاہر ہے کہ لکھنے والوں کا تحقیقی معیار ایک جیسا نہیں ہوسکتا اور معاشرے کے عام رجحانات سے محققوں کا دامن بچانا بھی ممکن نہیں۔ میرا خیال یہ ہے کہ اگر مختلف ادارے باہمی تعاون اور مرکزی منصوبہ بندی کے تحت اپنی تحقیقی حدود مقرر کر لیں تو ہمارے ہاں افرادی سرمائے اور مالی سرمایے دونوں سے زیادہ سے زیادہ کام لیا جاسکتا ہے۔ موجودہ صورت میں ان اداروں نے جو کچھ کیا ہے، اس کی رفتار کو دو حصوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے، ۱۹۴۷ء سے ۱۹۸۵ء تک مذکورہ بالا اداروں میں سے بعض وجود نہیں آئے تھے اور موجود تھے، ان کی پالیسی واضح نہ تھی، اس لیے اس دور میں کام کی رفتار بہت سست تھی۔ ۱۹۸۵ اگلے سے ۱۹۶۸ء تک ان اداروں کی کارگزاری کی رفتار اور کام کی مقدار میں خاصا اضافہ ہوا ان دس برسوں میں تحقیق کی سہولتوں کے بڑھ جانے اور مالی امداد کے اضافے سے ہمارا علمی، سرمایہ بعض اعلی درجے کی تحقیقی تصانیف سے مالا مال ہوا۔ اگر ہم مختلف اداروں پر ایک سرسری نظر بھی ڈالیں تو ہمیں اعلی پائے کی تحقیقی تصانیف کا کچھ نہ کچھ سرمایہ مل جاتا ہے۔
انجمن ترقی اردو کے اہم منصوبوں میں سے قاموس الکتب کا منصوبہ بہت اہم ہے۔ اس کی پہلی جلد، جو اردو میں مذہبی کتابوں کی فہرست پر مشتمل ہے، بعض جزوی امور سے قطع نظر، اردو کے علمی سرمایے میں بڑی اہمیت رکھتی ہے۔ فہرست مخطوطات اردو، کی جلد اول بھی انجمن کے علمی کام کا بہت اچھا نمونہ ہے۔ اس کے علاوہ انجمن ترقی اردو نے جو متین تصحیح کے بعد شائع کیے ان میں پھول بن، من لگن اور گلشن عشق کو امتیازی حیثیت حاصل ہے۔ چند مقالات کے مجموعے اور مونوگراف بھی انجمن کے علمی کام کا اچھا نمونہ ہیں۔ شمالی ہند کی نثری داستانیں، اردو تھیٹر، غالب فکر و فن، سرشار کی ناول نگاری، کاروان صحافت اور قدیم اردو، انجمن کے معیار کی ضمانت ہیں۔ اسی طرح اقبال اکیڈمی کی تصانیف میں اقبال کی غیر مدون تحریروں کے مجموعے اور تذکرہ شعرائے کشمیر قابل ذکر ہے۔ مسلم ایجوکیشنل کانفرنس نے ہمارے تعلیمی نظام کے متعلق بعض کتابیں شائع کر کے اردو کی علمی حیثیت کو مستحکم کیا ہے۔ سندھی ادبی بورڈ نے صوبہ سندھ، علاقے میں فارسی اور سندھی سرمائے کے علاوہ کچھ کچھ اردو کی طرف بھی نگاہ التفات کی۔ ترقی اردو بورڈ نے متن شائع کرنے کا کام بھی اپنے ذمے لیا لیکن اس میدان میں باغ و بہار کے سوا وہ کوئی اہم خدمت انجام نہیں دے پائے۔ اردو لغت کی اشاعت ان کا ایک اہم کارنامہ ہے اور اب تک جو اجزا چھپ کر سامنے آئے ہیں، ان سے یہ توقع کی جاسکتی ہے کہ اردو میں لغت کی ضرورت کو یہ ادارہ بہ خوبی پورا کر رہا ہے۔ اردو اکیڈمی بہاول پور کی کتابوں میں طبی لغت اور ڈاکٹر مہر عبدالحق کا تحقیقی مقالہ

خاصے کی چیزیں ہیں۔ اردو اکیڈمی لاہور نے درسی ضروریات کے علاوہ اردو کی قاموس شائع کر کے علمی سرمائے میں گراں قدر اضافہ کیا۔ مرکزی اردو بورڈ لاہور نے سائنسی کتابوں کے علاوہ اردو کو باثروت بنانے کے لیے تراجم کا سلسلہ بھی شروع کیا۔ اس لحاظ سے ان کی شائع کردہ کتابوں میں ''بلوغ الادب'' اور ''الاخبار الطوال'' تحقیقی اور علمی لحاظ سے اس ادارے کی دوسری کتابوں پر فوقیت رکھتی ہیں۔ پنجابی ادبی اکیڈمی نے تحقیقات چشتی اور بعض دوسری کتابیں شائع کر کے اردو ادب کو فائدہ پہنچایا۔ ہندو اکیڈمی نے پشتو ادب کے علاوہ اردو پشتو کے تعلق پر ایک کتاب شائع کر کے اردو کے لسانی جائزے میں ایک نئی منزل کا سراغ لگایا۔ مجلس ترقی ادب لاہور، نے بھی اپنی بساط کے مطابق اردو کی خدمت کی۔ مجلس ترقی ادب کے دائرہ کار میں کلاسیکی ادب کی اشاعت اہم ہے۔ ادارے نے فورٹ ولیم کالج کی تصانیف کو شائع کرنے میں خاصی محنت اٹھائی ہے۔ اس کے علاوہ تذکروں اور مصنفین پر کتابوں کے منصوبے بھی چل رہے ہیں۔

(۷)

سرکاری اعانت میں دیے جانے والے اداروں کے علاوہ بعض ناشروں نے بھی اردو ادب کی طرف توجہ کی۔ گلشن بے خار، کے دو ترجمے شائع ہوئے، خطوط غالب چھپی، حالی کا ذہنی ارتقاء انتخاب شاہ حاتم ہفت گلشن، داغ ناشرین کی مساعی کا نتیجہ ہیں۔ چند ایک اور کتابیں بھی ناشریں کی کوششوں سے شائع ہوئیں۔

تحقیق کا ایک اور مستقل حلقہ پاکستان کی یونیورسٹیاں ہیں۔ یونیورسٹیوں میں تحقیق کا کام خاصی مقدار میں ہوا ہے۔ پنجاب یونیورسٹی، کراچی یونیورسٹی، سندھ یونیورسٹی، پشاور یونیورسٹی اور زرعی یونیورسٹی میں تحقیق کا کام برابر ہو رہا ہے۔ بعض یونیورسٹیوں اور زرعی یونیورسٹی کے سوا، پی ایچ ڈی اور ڈی لٹ کے مقالے بھی شائع ہوئے ہیں۔

یونیورسٹیوں میں تحقیقی کام محتاج تعارف نہیں۔ تشکیل پاکستان کے بعد جتنے بھی تعلیمی کمیشن قائم ہوئے ،ان سب نے تحقیق پر زور دیا۔ قومی تعلیمی کمیشن کے قیام سے یونی ورسٹیوں میں تحقیقی کام کی اہمیت کا احساس بڑھ گیا۔ کمیشن کی رپورٹ میں اعلیٰ سطحوں پر تحقیق کی اہمیت کو پرزور الفاظ میں بیان کیا گیا۔ رپورٹ میں اس بات پر زور دیا گیا کہ یونی ورسٹی میں تحقیق کو اہم مقام دیا جائے، کیوں کہ تحقیق ایک استاد کو مستعد، متحرک، فعال اور جدید معلومات سے باخبر رکھنے کا وسیلہ ہے۔ چنانچہ سفارش کی گئی کہ ہر یونیورسٹی اپنے ہاں تحقیقی سہولتیں مہیا کرے اور تحقیقی شعبوں کو مضبوط بنیادوں پر استوار کر کے استادوں کی (تحقیقی کام کی بنیاد پر) مناسب حوصلہ افزائی کرے۔ کمیشن کی رپورٹ کے تمام پہلوؤں پر اگرچہ عمل

نہیں کیا جاسکا لیکن اس سے یونی ورسٹیوں میں تحقیقی کام میں سرگرمی پیدا ہوئی۔ گزشتہ دس سال (یعنی ۱۹۵۸ء تا ۱۹۶۸ء) میں یونی ورسٹیوں میں تحقیقی کام کی اہمیت پر خاصا اصرار کیا گیا ہے۔ مختلف یونیورسٹیاں اعلیٰ سطحوں پر تحقیق کے علمی کام پر خصوصی توجہ کر رہی ہیں۔

(۹)

گزشتہ دس برس کا تحقیقی کام بہ غور دیکھا جائے تو چار اہم رجحان نظر آتے ہیں اور گمان غالب ہے کہ مستقبل میں تحقیقی کام انہی مرکزی نکات سے متعلق ہوگا۔

(الف) قدیم ادبی سرمایے کی بازیافت اور متن کی مناسب تصحیح۔

(ب) پاکستان کے قدیم اردو ادیبوں اور شاعروں کے کارناموں کی مناسب اشاعت

(ج) اردو زبان کے لسانی رشتوں کا مقامی عناصر سے تعلق

(د) تدوین لغت اور اصطلاحات سازی کی اہمیت

یہ رجحانات ابھی ابتدائی حالت میں ہیں اور آگے چل کر ان سے تحقیق کی ایک منظم اور مربوط روایت کی داغ بیل کی توقع ہے۔ امید ہے آئندہ چل کر پاکستانی شعور اور پاکستانیوں کے عزائم کی جھلک تحقیقی میدان میں بھی نظر آئے گی۔

تحقیق کے تقاضے

اردو میں تحقیق کی روایت زیادہ قدیم نہیں، پہلی جنگ عظیم کے خاتمے کے بعد جب ترک موالات اور خلافت کی تحریکیں اٹھ رہی تھیں اور شعروادب کی دنیا میں جذباتیت عروج پر تھی، اردو ادب میں تنقید کے مقابلے میں تحقیق کا رجحان ترقی کر گیا۔ شبلی اور ان کے رفقاء کے ی بیشتر توجہ اردو ادب کے تخلیقی سر چشموں کی طرف تھی۔ اب جن فضلا نے نثر میں قدم رکھا وہ تحقیق کی طرف زیادہ راغب تھے: ڈاکٹر زور، عبدالسلام ندوی، سید سلیمان ندوی، عبدالحیٔ، ڈاکٹر عبدالستار صدیقی، مولوی عبدالحق، حافظ محمود شیرانی، پروفیسر محمد اقبال، ڈاکٹر مولوی محمد شفیع کے نام لیے جاسکتے ہیں۔ یہی وہ بزرگ ہیں جنہوں نے صحیح معنوں میں ریسرچ کا آغاز کیا، اردو فارسی اور عربی کے سرمایے کو بند الماریوں سے نکالا، متون کی ترتیب و تصحیح کی، تاریخ ادب کی گم شدہ کڑیوں کی دریافت کیا، زبان کے آغاز و ارتقا، کی نشان دہی کی ادبا اور شعرا کے حالات و واقعات کو متعین کیا اور وہ سرمایہ فراہم کیا جس سے تاریخ ادب کی تدوین کا کام ممکن نظر آنے لگا۔ یہ لوگ حقائق کی تاویل و تعبیر اور ان کی فلسفیانہ توجیہ کے دعوے دار نہ تھے۔

انہوں نے بیک وقت دو کاموں کا بیڑا نہیں اٹھایا بلکہ انہیں تو صرف یہ دھن تھی کہ جدید سائنٹیفک اصولوں پر متون کو درست کریں اور تاریخ ادب کے لیے خام مواد جمع کر دیں۔ وہ ادب کے تخلیقی عمل اور تنقیدی شعور کے لیے بنیاد مہیا کرتے تھے۔ انہیں احساس تھا کہ ابھی تاریخ ادب کی کئی شخصیتیں نامعلوم ہیں، لسانی مسائل مزید توجہ اور تفتیش کے محتاج ہیں اور شعرا وادبا کی زندگی کے واقعات کے بغیر تنقیدی فیصلے محض ہوائی باتیں ہوں گی۔ یہ نئی تحقیقی روایت یوں تو کئی ادبی مراکز میں دکھائی دیتی ہے لیکن مشرقی زبانوں کے علاوہ اردو کے لیے جو کام ہوا اس میں تین مقام خاص طور پر قابل ذکر ہیں اعظم گڑھ حیدر آباد (دکن) اور لاہور۔

یوں تو مشرقی زبانوں پر تحقیق کے کام کی ابتدا انیسویں صدی ہی میں ہو چکی تھی اور ایشیاٹک سوسائٹی (کلکتہ) اور اس کا جریدہ فلالوجی کے اصولوں پر زبانوں کی شجرہ بندی اور نشو ونما کو جانچ رہا تھا لیکن اس ادارے کی مرکزی توجہ سنسکرت اور آریائی زبانوں کی طرف تھی۔ ولیم جونز کی لسانی دریافت برگ و بار

لانے لگی۔ یونیورسٹیوں میں اسی نوع کا کام ہونے لگا۔ مغربی یونیورسٹیوں کے تربیت یافتہ لوگ یہاں آکر مختلف تعلیمی اداروں میں اسی نوعیت کا کام کرنے لگے۔ ان جوانوں کی علمی مساعی میں زیادہ اہمیت متون کی ترتیب وتحشیہ کو حاصل تھی اور ان کی نظری بحثیں لفظوں کے عہد بعہد تغیرات تک محدود تھیں، یہ تحقیق کی لسانی روایت بیسویں صدی کے اداروں میں بھی سرایت کرگئی، لیکن مقامی ضرورتوں کے لحاظ سے اس کی تفصیلات میں فرق ہوتا گیا۔

دکن میں ڈاکٹر زور اور ان کے رفقا خصوصاً سید محمد، ڈاکٹر سروری اور نصیر الدین ہاشمی نے دکنی ادب کے متن کی تصحیح کا کام شروع کیا اور لسانی لحاظ سے زبان کے ارتقا کا جائزہ لیا۔ اس تحقیقی روایت میں یہ کمی رہ گئی کہ متن کی تصحیح میں مرتبین نے قلمی نسخوں کے تمام اختلافات کو اپنے ہاں درج کرنے کا جھگڑا نہیں پالا، دوسرے فطری بحثوں اور ادبا وشعرا کے حالات کی تلاش میں اپنا زیادہ سروکار ادبی کتابوں سے رکھا اور تاریخوں سے حاصل ہونے والی معلومات کو ادبی مواد سے مطابقت دینے کی زیادہ کوشش نہیں کی، اس لیے ان محققین کے علمی کارناموں میں واقعات وسنین کی غلطیاں زیادہ ہیں۔ تاہم اس علمی مرکز نے دکنیات کے ذخیرے کو زندہ کیا اور لسانیات کو فلالوجی کی حدود سے نکال کر صوتیات کے علم سے ملا دیا۔ ڈاکٹر زور کی کتابیں ہندوستانی لسانیات اور Daccani Phonetics بہت اہم ہیں۔ لسانیات کا علم ڈاکٹر مولوی عبد الحق اور ڈاکٹر عبد الستار صدیقی سے گہرائی اور توانائی حاصل کرتا ہے۔ آگے چل کر اس ذہنی رجحان نے ڈاکٹر شوکت سبزواری اور ڈاکٹر مسعود حسین خاں کے لیے لسانیات کو مستقل موضوع بنایا۔

دکنی مصنفین کی کاوشیں ادبی ہیں، اس کے مقابلے میں دار المصنفین کی تحقیق مذہبی رجحانات کے لیے مخصوص ہے۔ مشرقی علوم کی ترویج کی حد تک ان مصنفوں نے عربی اور فارسی کے بعد اردو ادب کی طرف توجہ کی۔ اس لیے ادب کو ان کی تالیفات کے خاکے میں ضمنی حیثیت حاصل ہے۔ شبلی کی مورخانہ بصیرت نے ان محققین کو ادب کا راستہ تاریخ کے واسطے سے دکھایا۔ ان کے ہاں متن کی ترتیب وتحشیہ کو زیادہ اہمیت نہیں بلکہ اخذ وترجمہ کو زیادہ نمائندگی حاصل ہے۔ سید سلیمان ندوی، عبد الماجد دریا آبادی، صباح الدین عبد الرحمٰن، عبد السلام ندوی اور عبد الحئی کے نام اس ادارے کی علمی وادبی کارگزاری میں قابل ذکر ہیں۔

اعظم گڑھ کے ادبا محققین کی طرح لاہور کے محققین بھی شرقی علوم کی برتری کے قصیدہ خواں ہیں۔ یہاں سنسکرت اور آریائی زبانوں کا لسانیاتی مطالعہ ولنر کے بعد سے محدود ہوگیا اور اس کی جگہ عربی، فارسی اور اردو ادب کے مطالعے میں صرف کہیں کہیں فلالوجی کی جھلک پائی جاتی ہے ورنہ ان محققین نے لفظوں کے نسب نامے اور زبانوں کے شجرے بنانے کی بجائے مسلمانوں کے علوم کو زندہ کرنے کی کوشش کی۔ اس تگ ودو میں قلمی کتابوں کے متن ترتیب دینے کو اہم جانا۔ یہاں کیمبرج کی روایت زیادہ استعمال

میں آئی اور معمولی سے معمولی اختلاف نسخ کو بھی حواشی میں جگہ دی گئی۔

دبستان لاہور کے محققین مختلف علوم اور مختلف زبانوں کے مطالعے کو بھی ضروری قرار دیتے ہیں۔ وہ ادب کو جداگانہ اکائی نہیں مانتے بلکہ معاشرتی علوم کے وسیلے سے ادب کے مختلف رشتے دریافت کرتے ہیں۔ خصوصاً تاریخ کو ان کے نظام تحقیق میں اساسی رتبہ حاصل ہے۔ اگر یہ کہا جائے کہ یہ لوگ بنیادی طور پر مورخ ہیں تو بے جا نہ ہوگا۔ ادب سے حاصل شدہ واقعات وسنین اور حالات وکوائف کو تاریخ کی مدد سے دریافت شدہ مواد کے ساتھ تطبیق دے کر مقالہ نگاری کی روش، بہت نتیجہ خیز رہی۔

یہ تحقیقی روایت حزم واحتیاط کا اچھوتا معیار پیش کرتی ہے۔ فراموش شدہ مصنفین کے حالات کی تلاش، عام اور مسلمہ ادبی مفروضوں کی بے رحمانہ چھان بین، تمام معلومہ مواد کو جرح وتعدیل کی کسوٹی پر کسنا، حوالے کے قلم بند کرنے میں کامل احتیاط اس گروہ کا امتیازی کارنامہ ہے۔ یہ لوگ معیار پر بہت زور دیتے تھے۔ سہل انگاری اور صحافتی انداز بیان انہیں ناپسند تھا۔ شاعرانہ اسلوب کو بھی ان لوگوں نے خیر باد کہی اور اردو میں ایسی جامع زبان کی داغ بیل ڈالی کہ اس میں علمی باتوں کے بیان کی صلاحیت پیدا ہوگئی۔

اردو انسائیکلو پیڈیا کی زبان اپنی غرابت کے باوجود accuracy کے اعتبار سے اردو کے علمی سرمایے میں گراں قدر اضافہ ہے۔ ان اصحاب کمال کے ہاں تحقیقی کام میں غفلت یا عدم احتیاط جرائم میں داخل تھی اور ایسے مواقع پر ان کی گرفت سخت ہوئی تھی۔ اس محاسبے کی زد میں بعض بڑی بڑی شخصیتیں بھی آتی تھیں؛ چاہے سید سلیمان ندوی ہوں یا پروفیسر حبیب ان کی کڑی تنقید معاف کرنا نہیں جانتی تھی۔ پروفیسر شیرانی کی تنقید شعر العجم، تنقید بر آب حیات، مغلوں سے قبل فارسی ادب، خزائن الفتوح، اس رجحان کی عظیم یادگاریں ہیں۔ اب چاہے کوئی اسے منفی طریقہ قرار دے، چاہے ظالمانہ کہے حقیقت یہ ہے کہ اس سخت رویے نے ہمارے تحقیقی معیار کو مدتوں گرنے نہیں دیا اور کسی بڑے سے بڑے محقق کو بھی یہ جرأت نہ تھی کہ ''طومار نویسی'' کو شعار بنا کر کھرے کھوٹے کی تمیز مٹا سکے۔ شیرانی کا بے رحم قلم طنز و تعریض کے راستے سے اپنا کام کر جاتا تھا۔

اس تحقیق کا ایک اور پہلو بھی اہم ہے اور وہ ریاضت کا عنصر ہے۔ اس کی عمدہ مثال ڈاکٹر مولوی محمد شفیع کی ذات گرامی ہے۔ ایک ایک حوالے کا احتیاط سے اصل کے ساتھ مقابلہ، ثانوی مآخذ اور بنیادی مآخذ کے استعمال میں امتیاز، دلائل کے سلسلوں کو ہر پہلو سے دیکھنا، نسخوں کی قدامت کا تعین، رسم الخط کی شناخت، املا کے خصائص کا ادراک، کاغذ کی قدامت اور سبک شناسی کا شعور، شفیع صاحب کی ذات میں جمع تھا۔ وہ حوالوں کے اندراج میں اخلاقی قدروں پر سختی سے عمل پیرا تھے اور متاخر حوالوں کو بھی نظر انداز کرنے کو ادبی بددیانتی جانتے تھے۔ ان کے ہاں اقتباسات اور اپنی عبارتوں کے درمیان گہرا تعلق ہوتا تھا۔ وہ اس طرح جرح اور محاکمہ کرتے تھے اور استخراج نتائج کا عمل یوں اقتباسات کے ساتھ پیوست

ہو جاتا تھا کہ حوالے مولوی صاحب کی عبارتوں کا ضروری حصہ ہو جاتے تھے۔ ان کے فارسی اور عربی کام سے قطع نظر اردو میں اس نوع کے مقالات میں محمد حسین آزاد، ذوق اور داغ پر ان کے مقالے تحقیق کے اعلیٰ نمونے ہیں۔

ان جامع کمالات شخصیتوں کے علم اور مطالعے کی حدود کا احصا ممکن نہیں۔ پروفیسر شیرانی نے عربی، فارسی اور اردو کو تاریخ کے مطالعے کی مدد سے روشن کیا۔ ڈاکٹر مولوی محمد شفیع نے عربی کا استاد ہوتے ہوئے زیادہ علمی کام فارسی کے بارے میں کیا اور ترکی، فرانسیسی اور جرمن زبانوں کی مدد سے اپنے موضوعات کے دور دراز گوشوں کو دیکھا۔ ڈاکٹر اقبال نے عربی اور فارسی کے پیوند سے آثار قدیمہ اور تاریخ کے ہفت خواں کو طے کیا اور ایران قدیم کی زبانوں خصوصاً پہلوی کو سیکھا۔ پروفیسر شوشتری بی۔ ایس۔ سی بکٹر یالوجی ہوتے ہوئے عربی، فارسی، اردو، ہندی اور سنسکرت میں عالمانہ مرتبہ رکھتے تھے۔ ڈاکٹر سید عبداللہ نے عربی، فارسی اور اردو پر سہ زبانوں کے بارے میں تحقیقی اور علمی کام کیا۔ یہ 'آوارہ خرامی' ان بزرگوں کی علمی جدوجہد کا محور ہے۔ وہ کسی ایک مضمون پر بند نہیں تھے مختلف علوم اور زبانوں کی مدد سے تحقیقی مقالات کی تحریر میں وسعت اور گہرائی پیدا کرتے اور علوم کی اکائیاں بنانے کی بجائے کل پر نظر رکھتے تھے۔ اس سے ان کے علمی کارنامے پائیدار اور عظیم ہوئے۔